وقت کی فصیل
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
محمد حامد سراج

ماں، باپ
کی گم شدہ چھاؤں کے نام

جو
میرے گھر اور شہر خموشاں کے درمیان کہیں کھو گئی
جانے میرا مسکن کون سا ہے؟
یہ گھر۔۔۔؟
جس میں صرف سانس لینے کا عمل باقی رہ گیا ہے
یا شہر خموشاں۔۔۔؟
جسے والدین نے اپنی چھاؤں سے جا آباد کیا

کہانی میری اور میں کہانی کا ہوں

محمد حامد سراج

فہرست

گلوبل ولیج

خبر آئی۔۔۔۔۔

ساری بستی کی بینائی جاتی رہی۔

اک کہرام مچ گیا۔ سب ایک دوسرے کو ٹٹولتے، چیختے، دیواروں سے سر پھوڑتے اور پوچھتے تھے یہ کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔؟ رات میں ہم سوئے تو اچھے بھلے تھے۔ صبح دم آنکھ کھلی تو ہر گھر میں دبا دبا شور تھا اور پھر پوری بستی شور کی لپیٹ میں آ گئی۔ سب کو اپنے اپنے حصے کا گناہ معلوم تھا لیکن وہ سوچ رہے تھے کہ ایسا کون سا اجتماعی گناہ ہوا ہے جس کی پاداش میں پوری بستی کی بینائی جاتی رہی۔ بستی کے معالج بھی بصارت سے محروم ہو گئے تھے۔

ایک نابینا نے ٹٹول ٹٹول کر ایک فون نمبر ملایا اور بولا۔

ڈاکٹر تمھیں خبر ہے بستی پر رات بھر میں کیا قیامت گزر گئی۔۔۔۔۔؟

ہاں معلوم ہے۔۔۔۔۔!

ڈاکٹر تم کچھ کرو۔۔۔۔۔ تمہارے کلینک پر تو ایسی ایسی ادویہ سجی ہیں کہ تم کہا کرتے تھے کہ ہم خوابوں کا بھی علاج کرتے ہیں۔ تمھارا تو یہ بھی کہنا تھا کہ بستی میں کوئی وبا پھوٹ پڑے تو ہمارے طریقۂ علاج کا یہ کمال ہے کہ پانی کی سپلائی لائن میں ایک قطرہ دوائی کا ڈال دیں تو پوری بستی شفایاب ہو جائے۔ آج پوری بستی کی بینائی جاتی رہی ہے، کچھ تو کرو۔

دوائی تو ہے۔۔۔۔۔ لیکن ہزاروں ادویہ میں رکھی اس دوائی کے نام کی شناخت کیسے ہو۔۔۔۔۔؟

ڈاکٹر کی آواز میں لرزش تھی۔

ڈاکٹر۔۔۔۔۔ڈرو اس وقت سے جب سماعتیں اور قوتِ گویائی بھی چھن جائے گی۔

اسی طرح ساری بستی رانگ نمبر ملا کر ایک دوسرے سے حال احوال پوچھتی رہی کہ شاید کہیں، کسی کی آنکھ میں بینائی کی رمق باقی ہو۔

اگلی صبح پھر کہرام مچ گیا۔۔۔۔۔

پوری بستی کی حاملہ عورتوں کے پیٹ بنجر ہو گئے۔

تو کیا اب کوئی کوکھ ہری نہیں ہوگی۔ زمین پر نسلِ انسانی قحط کا شکار ہو جائے گی؟ نسلِ انسانی عنقا ہو گئی تو پھر کرۂ ارض پر کون رہے گا۔۔۔۔۔؟ کوئی نئی مخلوق یا اسے ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔۔۔۔؟ کیا اِذَالشَّمْسُ کُوِّرَتْ کا لمحہ آن پہنچا ہے؟ ہم ذکرِ الٰہی سے اپنی زبانوں کو تر تو رکھتے تھے۔۔۔۔۔ان کے پاس اپنے ہی سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ سماعت اور قوتِ گویائی کی سلامتی پر ربّ العالمین کے شکر گزار تھے۔۔۔۔۔

بہت دن گزر گئے۔۔۔۔۔سال یا شاید صدیاں۔۔۔۔۔!

اچانک بستی میں ایک ایسی خبر اُڑی کہ خوشی سے نابیناؤں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔

کہیں یہ خبر جھوٹی نہ ہو۔۔۔۔۔؟

کیا سچ مچ ایسا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔؟

رب نے ہماری دعائیں سن لی ہیں۔۔۔۔۔ہماری بینائی لوٹ آئے گی۔۔۔۔۔؟

خبر یہ تھی کہ بستی میں ایک عورت کی گود ہری ہو گئی ہے۔ وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ آنے والا نومولود جب سنِ رشد کو پہنچے گا تو ہمیں کرۂ ارض کی پوری خبر دے گا۔ شاید کمپیوٹر، کینسر اور ایڈز کے علاج کے بعد سائنس نے کوئی ایسی دوا ایجاد کر لی ہو جو پوری بستی کی بینائی کے لیے بینا ثابت ہو۔

جب نومولود سنِ رشد کو پہنچا،

اس کی ماں نے ٹٹول ٹٹول کو اس کے خدوخال دیکھے۔ اس کی آنکھوں کو چوما۔ بستی میں وہی ایک بینا تھا۔ اس نے بستی کے سارے لوگوں کو جمع کیا۔ ان سب کو کھولت نے آلیا تھا۔

دیکھ بیٹا۔۔۔۔۔! تو دنیا کے سفر پر نکلنے والا ہے۔ ہم صدیوں سے اندھیرے میں سانس

لے رہے ہیں۔ ہم اس بات سے بے خبر ہیں کہ سورج طلوع ہوتا ہے کہ نہیں؟ رات کو چاند چاندنی بکھیرتا ہے یا نہیں۔۔۔۔۔؟ ستاروں کی چادر آسمان پر تنی رہتی ہے یا نہیں۔۔۔۔۔؟ ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ جب ہماری بینائی چھن گئی تھی اس وقت کرۂ ارض ایٹم بم کی زد میں تھا۔ دنیا کے سات ممالک نے کامیاب ایٹمی دھماکے کر کے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد پاکستان اور ہندستان ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑے تھے۔ برّاعظم ایشیا سلگ رہا تھا۔ بیسویں صدی کو کمپیوٹر کی صدی قرار دے دیا گیا تھا۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں DNA کو تو دریافت کرلیا گیا تھا لیکن ایڈز اور کینسر جیسے مہلک امراض کا علاج ابھی دریافت نہیں ہوا تھا۔ کلوننگ کے کامیاب تجربے کے بعد اس پر پابندی لگ چکی تھی۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے تجربے کے بعد بہت سی ماؤں کی گود ہری ہونے لگی تھی۔ مریخ سے تصاویر آچکی تھیں۔ مریخ کی پتھریلی چٹانوں کی تصاویر میں نظر آنے والی دراڑوں سے سائنس دان اندازے لگا رہے تھے کہ شاید وہاں پانی اور ہوا ہے۔ لیکن وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے۔ نت نئے میزائلوں اور تباہ کن ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات بچوں کا کھیل تھے۔ بڑے ممالک اپنے مفادات کی خاطر چھوٹے ممالک پر چڑھ دوڑتے تھے اور دہشت گردی کے نام پر انھیں کچلنا اپنا حق سمجھتے تھے۔

اس دور میں دو نام بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ IMF اور ورلڈ بینک۔۔۔۔۔ ان دونوں نے پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے ساتھ معاشی جنگ کا آغاز کیا اور انھیں کنگال کر کے رکھ دیا۔

سن رہے ہو۔۔۔۔۔نا۔۔۔۔۔؟

اس وقت روس ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ ریاستیں آزاد تو ہوگئی تھیں لیکن حکمران کٹھ پتلی تھے۔ گلف میں بھی یہی صورت حال تھی۔ تیل کے کنوؤں پر عالمی طاقتیں پنجے گاڑے بیٹھی تھیں۔۔۔۔ اس عہد میں جھوٹ، فریب، رشوت اور ملاوٹ کا چلن عام تھا۔ کاروبارِ زندگی میں جھوٹ، فریب اور رشوت اتنی ہی ضروری قرار دے دی گئی جتنی زندہ رہنے کے لیے سانس لینا ضروری ہے۔ کرۂ ارض کو گلوبل ولیج قرار دے دیا گیا تھا اور اس میں سودی کاروبار اور سودی قرضہ جات کو قانونی اور حکومتی تحفظ حاصل تھا۔ تعلیم اور علاج جیسے شعبے بھی خدمتِ خلق کے دائرے سے نکل کر مکمل طور پر کمرشل اور کاروباری ہو گئے تھے۔ جاں بلب مریضوں کے ورثا سے لاکھوں

روپیہ بٹور لینے کا چلن عام تھا۔ بے حیائی اور فحاشی شرافت کے زمرے میں شمار ہونے لگی تھی۔ اسے فنونِ لطیفہ کے نام سے فروغ دیا جاتا تھا۔

پھر ہماری بینائی چھن گئی۔۔۔۔۔ ہماری آخری کاشت یہی تھی جو تمھیں تفصیل سے بتادی ہے۔۔۔۔۔اب تم دنیا کے سفر پر نکلو اور دیکھو انسان کہاں پہنچا ہے۔۔۔۔۔؟

وہ دنیا کے سفر پر نکلا۔۔۔۔۔ جوں جوں سفر طے کرتا گیا خوف اس کی رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ وہ جس برِاعظم میں بھی جا اترا، وہاں کھیتوں میں تھوراُگا ہوا تھا۔ خاردار جھاڑیاں اور پودے کانٹوں سے اٹے تھے۔ کارخانے بنجر پڑے تھے۔ کہیں کوئی متنفس دکھائی نہیں نہ دیتا تھا۔ جنگل جانوروں سے اور آبادیاں پرندوں سے خالی تھیں۔ جانے وہ کہاں نقل مکانی کر گئے تھے۔۔۔۔۔؟ وہ دنیا کے تمام بڑے اور بارونق شہروں میں گیا۔ سب ویران پڑے تھے۔ ہر طرف اُلّو بول رہے تھے۔ دریا، سمندر خشک اور پانی کے کنوؤں کے پیندے سیاہ تھے۔

زمین پر بڑے بڑے ہولناک گڑھے اس بات کا ثبوت تھے کہ پورا کرۂ ارض ایٹمی جنگ کی لپیٹ میں رہا ہے۔ اسے کہیں کسی آبادی کا نشان نہ ملا۔ ہولناک سناٹا تھا۔ وہ سوچتا رہا، یہ کیا ہے۔۔۔۔؟ خوف کے رتھ پہ سوار جب اس نے پورے کرۂ ارض کا چکر مکمل کر لیا، تو سوچنے لگا۔۔۔۔۔

یہ سب وہ ہے جو ہمارے آباؤ اجداد نے ہمارے لیے کاشت کیا۔

اُسے بس ایک جگہ ایسی مخلوق نظر آئی جسے انسان نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ تھور اور کانٹے دار جھاڑیاں کھا رہے تھے۔

وہ ان کے پاس پہنچا اور پوچھا

تم کون لوگ ہو۔۔۔۔۔؟

ہم اس کرۂ ارض پر بسنے والی انسانی مخلوق کی آخری باقیات میں سے ہیں اور وہ کاٹ اور کھا رہے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد نے کاشت کیا۔

وہ الٹے پاؤں ہانپتا کانپتا سفر کی صعوبتیں جھیلتا بستی میں پہنچا۔

بستی کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔

کوئی خبر۔۔۔۔۔؟ ان کے بے نُور چہروں پر سوال تنے تھے۔

خبر ہے۔۔۔۔۔!

کیا۔۔۔۔۔؟

میں نے اپنی آنکھوں میں گرم سلائی پھیر لی ہے۔۔۔۔۔!

نقش گر

ماسکو کی TRETYAKO گیلری میں گھومتے ہوئے وہ ایک پینٹنگ کے سامنے رک گیا۔

TERRACE ON THE SEA SHORE 1828.

طویل برآمدے کے ستون کے ساتھ ایستادہ لڑکے کے سر پر سرخ ٹوپی تھی۔ لڑکے کے سامنے ایک معصوم بچہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ برآمدے کی چھت پر بیلیں پھیلی تھیں۔ پوری چھت بیلوں سے ڈھکی تھی۔ اطراف میں شاخیں لٹک رہی تھیں۔ برآمدے کے کچے فرش پر تاحدِ نظر سائے بچھے تھے۔ اس کی عمیق نظریں جانے پینٹنگ میں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ برآمدے کی چھت اس ترتیب سے بنی تھی کہ ستونوں پر ترتیب سے لکڑی کی بلیاں رکھی تھیں اور ہر ستون کے ساتھ بیلیں اٹھ کر برآمدے سے گلے مل رہی تھیں۔ طویل برآمدے کے اختتام پر کچا راستہ دور تک چلا گیا۔ وہ کچے راستے پر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ برآمدے میں پھیلتے ہوئے سایوں نے اسے روک لیا۔ دائیں جانب ملگجے اندھیرے میں ایک دہقان پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ پینٹنگ پر غور کرنے سے نئے زاویے اس پر وا ہونے لگے۔ پینٹنگ نے اسے جکڑ لیا۔ وہ اس کے سحر سے نکلنا

چاہتا تھا، لیکن اسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں کسی نے میخوں سے جڑ دیئے ہیں۔
سائے اور پھیلنے لگے۔
کونے میں موجود دہقان بچہ کچی دیوار کے ساتھ اونگھنے لگا۔
پس منظر میں پانی اور پہاڑ اسے بلا رہے تھے۔ اس نے قدم اٹھائے اور کچے راستے پر ہو لیا۔ سمندر کے ساتھ ساتھ وہ ایک پہاڑی راستہ طے کر کے ایک جھونپڑی کے سامنے رک گیا۔
چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ کوٹھی کی بناوٹ چھونپڑی کی طرز پر تھی۔ چاروں اور گھنا جنگل تھا۔ کھلے پھاٹک سے وہ اندر داخل ہوا۔
ایزل اٹھائے ہوئے وہ برآمدے سے گذر رہی تھی۔ اسے پکارتے پکارتے وہ رک گیا، جانے کیوں۔۔۔؟
آتشدان کے سامنے بچھے ایرانی قالین پر وہ اپنی ساری پینٹنگز پھیلائے اسے بتا رہی تھی کہ جنوں اسے کہاں تک لے آیا ہے۔ وہ دونوں ایک عرصے بعد ملے تھے۔ آتشدان کی راکھ میں چنگاریاں باقی تھیں۔
تم نے مصوری ترک تو نہیں کی نا۔۔۔؟ ماتھے پر آئی لٹ کو اس نے سمیٹتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔۔۔"
"آج کیسے آئے ہو۔۔۔"
"میں راستے بھولنے لگا ہوں۔۔۔"
شاید مجھے بھی۔۔۔
تمہیں بھول گیا ہوتا تو تمہارے سامنے نہ ہوتا۔
تمہارے بال پہلے دن کی طرح بے ترتیب ہیں۔
میں بے ترتیب بالوں اور بے ترتیب زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔
میں نے تو تمہیں ترتیب دینے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔
میں تمہاری پینٹنگ ہی کب تھا جو تم مجھ پر توجہ مرکوز رکھتیں۔
"ایک SUBJECT پر کام کرو گے؟"
تمہیں سوچنے کے سوا سارے کام چھوڑ دیئے ہیں۔

چھوڑو نا۔۔۔ پہیلیاں۔۔۔۔ جو سبجیکٹ میں تمہیں دے رہی ہوں اس پر کام کرو گے تو لیونارڈو ڈونچی کی طرح امر ہو جاؤ گے۔

میری زندگی میں کوئی مونالیزا نہیں ہے۔

ہے۔۔۔۔

نہیں۔

لیونارڈو ڈونچی بھی ہے اور مونا لیزا بھی۔ مجھے دیکھو، میرے بدن پر نقش گری کرو گے۔۔۔؟

میں سمجھ نہیں پایا۔

سمجھ لو میں ایک کاغذ ہوں۔

تم ہوش میں تو ہو۔۔۔؟

"تمہیں پانے کے بعد ہوش کھویا ہی کب ہے۔"

آتشدان میں لکڑیاں چیخ رہی تھیں، سرخ چنگاریاں، اس کی آنکھوں کی طرح لال انگارے۔۔۔ اسے سردی محسوس ہونے لگی، عجیب پاگل لڑکی ہے۔

سامنے بٹھا کر تمہارا پورٹریٹ تو بنایا جاسکتا ہے لیکن بدن پر نقش گری، نہیں۔۔۔۔ ناممکن۔۔۔!

میں پیرالوئی کی افروڈائٹ ہوں۔ سلیم کی انارکلی اور اختر شیرانی کی سلمیٰ، میں ہر عہد میں زندہ رہتی ہوں۔ میں اجتماعی لاشعور کا تسلسل ہوں۔ تم کیسے فنکار ہو؟ ایک چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔ تم نے زندگی میں کتنی ہی تصاویر بنائی ہوں گی۔ میرا بدن ایک کاغذ سے بھی کم قیمت ہے۔۔۔؟ تمہیں اس سرد برفیلی شام کی قسم، تمہیں میری اس خواہش کی تکمیل کرنا ہوگی۔

میری بینائی جاتی رہے گی۔

بینائی رہے رہے، نہ رہے۔۔۔ میں نے تم سے اور مانگا ہی کیا ہے؟ ایک چھوٹی سی خواہش، معصوم سا خیال، تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟

آتشدان میں شعلے سر ہونے لگے۔

تم آج رات یہیں قیام کرو گے۔ میں تمہیں سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لئے پوری رات

دے رہی ہوں۔

اس نے رات کروٹیں بدلتے گذار دی۔ اس کے دماغ کے کینوس پر سارے رنگ گڈمڈ ہونے لگے۔ برش اس کے کانپتے ہاتھوں سے گرتے رہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا، کہاں کون سا رنگ بھرنا ہے؟ وہ سوچتا رہا۔

بولتے بدن کے زندہ زاویوں میں نقش گری کیسے ممکن ہے۔۔۔؟ یہ لڑکی پاگل ہے، اسے کیسے سمجھایا جائے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔

صبح دم جنگل میں بجری کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اس نے اسے سمجھایا۔ تم اپنا سیلف پورٹریٹ کیوں نہیں بناتیں۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔؟"

"ممکن ہے۔۔۔آؤ"

وہ پگڈنڈی سے اتر کر کچے راستے پر ہو لئے۔ بیلوں تلے اونگھتے برآمدے سے گزر کر وہ TRETYAKI GALLERY میں کھڑے تھے۔

یہ دیکھو، ZINAIDA ہے۔

SELF PORTRAIT AT THE DRESSING TABLE.

وہ پینٹنگ کو غور سے دیکھتی رہی اور اس میں تحلیل ہو گئی۔

"ہاں یہ میں ہوں، بالکل ZINAIDA، میں نے کتنی محنت کی ہے۔ دیکھو میں نے اپنے لمبے براؤن بال بائیں ہاتھ سے پکڑ رکھے ہیں اور دائیں ہاتھ سے کنگھی کر رہی ہوں۔ میرا سراپا دیکھو۔ بدن کے زاویوں پر غور کرو اور سنگھار میز پر بکھرا میک اپ کا سامان، موم بتیاں، پرفیوم، ہار اور سٹیل اسٹک، دائیں کلائی میں چھن چھن کرتی چوڑیاں دیکھ رہے ہو نا، غور کرو، یہ میں ہوں۔

وہ پینٹنگ کے سحر سے نکلی تو بولی، سیلف پورٹریٹ۔۔۔لیکن؟ لیکن کیا۔۔۔؟

ZINAIDA کی تکمیل تمہارے بغیر نہیں ہوگی۔ تم رات کسی فیصلے پر پہنچے؟ مجھے انکار یا اقرار میں جواب دو، تیسرا راستہ بھول جاؤ۔

اس نے چودھویں کی چاندنی میں نقش گری کا وعدہ کر لیا۔ وہ جنگل میں چاند ڈھونڈنے

لگی۔طلوع وغروب کا حساب رکھنے لگی۔ یہ ایک نیا اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے کلینڈر کی عادی چلی آ رہی تھی۔ چاند کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا بدن کروٹیں لینے لگا۔سمندر میں زیروبم اٹھنے لگے۔ٹھہرے پانی میں اتھل پتھل ہونے لگی۔لہریں چٹانوں سے سر پٹخنے لگیں۔وہ سوچنے لگی، چاند ایک ہی رات میں مکمل کیوں نہیں ہو جاتا۔اس کے نقوش گھٹتے بڑھتے کیوں ہیں۔اس کی تکمیل میں ایک رات باقی تھی۔اس کی بے چینی سوا ہونے لگی۔ بجری کے راستے پر درختوں کی اوٹ میں اس نے اپنے بدن کے خطوط کو غور سے دیکھا اور لوٹ کر آتشدان کے سامنے اپنی پینٹنگز کے درمیان اس کا انتظار کرنے لگی۔

اس نے میز سجائی، دو مگ، کافی، ڈرائی ملک، ڈرائی فروٹ، پینٹنگ کا سامان، سارے برش ایک ایک کر کے دھوئے اور ہاتھ کی ہتھیلی پر ان کی نرمی محسوس کی۔ساری چیزوں پر ایک نظر ڈال کو تسلی کی۔اسے آج کی رات امر ہونا تھا۔مونا لیزا کی طرح۔

VASILY TROPININ کی LACE MAKER کی طرح اسے بھی پینٹنگ کی دنیا میں ناموری ملے گی۔ پہلے وہ مسکراتی، سیٹی بجاتی اور ٹہلتی رہی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں اترنے لگیں۔وال کلاک کی سرکتی سوئیاں اسے چبھنے لگیں۔اس نے منفی خیالات کو جھٹکاتے ہوئے سوچا۔

نہیں، نہیں وہ ضرور آئے گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ نہ آئے۔کسی مصوّر کی اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک لڑکی اپنے بدن پر نقش گری کی فراخدلانہ دعوت دے۔

رات آدھی سے زیادہ گذر گئی۔کھڑکی سے اس نے پردہ سرکایا، چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ پوری آب وتاب کے ساتھ۔ابھی وہ نامکمل تھی۔ تکمیل کار جانے کہاں رہ گیا،" جنگل میں خاموشی تھی۔ گہری اور گمبھیر" اس کے دل میں چاند کو پکڑنے کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔کھڑکی کے شیشوں پر قطرہ قطرہ نمی اترتی رہی۔اس کی آنکھ کی کھڑکیوں کے شیشے بھی آنسوؤں کی ہلکی پھوار سے نم ہو چلے تھے۔وہ کیوں نہیں آ رہا؟ اسے آ جانا چاہیئے تھا۔

وہ پلٹی۔

کمرے کی ترتیب پر ایک نظر ڈالی۔اس کے سوا ہر چیز ترتیب سے تھی۔وہ ضرور آئے گا۔اس نے ایک برش اٹھایا۔دوبارہ اپنے بدن پر اس کی نرماہٹ محسوس کی۔ پینٹنگ ٹرے میں

رنگوں کی آمیزش سے ابھرنے والے بے ترتیب نقوش کو دیکھا۔ یہ بھی تو ایک پینٹنگ ہے میری طرح! وہ پلنگ پر آ بیٹھی۔ تکیہ گود میں رکھ کر خاموش آوازیں سننے لگی۔ سناٹے بول رہے تھے۔ جنگل اداس تھا، اس نے موسیقی کی آواز تیز کر دی۔

وہ یہیں کہیں موجود ہے، میری بصارت کو کیا ہوا ہے؟ منظر دھندلا کیوں رہے ہیں؟ میں اسے محسوس کیوں کر رہی ہوں، چھو کیوں نہیں پا رہی؟

اس نے آتشدان میں لکڑیاں ڈالتے ہوئے انگارے غور سے دیکھے، سرخ اور دہکتے ہوئے، یہی جگہ ہے نا۔ پہلی بار آیا تھا وہ، یہی کمرہ، یہی آتشدان، بے ترتیب بال، آنکھوں میں گلابی ڈورے، پتلون سے باہر لٹکتی شرٹ اور ہاتھوں میں سلگتا سگار لئے وہ دیوار پر آویزاں میری پینٹنگز میں کھویا ہوا تھا اور میں اس میں کھو گئی تھی۔ پینٹنگز دیکھتے دیکھتے پلٹا تھا تو میں کھڑی تھی۔ اسے سکتہ ہو گیا۔ میں بھی اپنی پینٹنگز بھول گئی۔ اس نے بے اختیار غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ چوم لیا۔ اچانک۔۔۔۔ اور میں انہی چومے ہوئے ہاتھوں سے تصویریں بناتی رہی۔ میری ہر تصویر میں اس کے لمس کی مٹھاس
تھی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میری ہر تصویر میں تمہاری خوشبو ہے۔ اس نے میری آنکھیں چوم کر کہا۔

"کیا کہا۔۔۔؟" کچھ یاد نہیں آ رہا، پاگل ہو جاؤں گی میں۔ آنا چاہیئے تھا اسے، ایک بار، ہاں ایک بار اس نے کہا تھا، میں تمہارے بدن پر اپنا لمس پینٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے انکار ہی کب کیا تھا۔ ایسی ہی رات تھی، یخ بستہ اور تاریک، مشعل کی روشنی میں اس نے مجھے منیر نیازی کی ایک نظم سنائی تھی۔۔۔ حرف حرف یاد ہے مجھے۔

اس کی آنکھیں کالے بھنوروں کی حزیں گنجار ہیں
ہونٹ اس کے عطر میں بھیگے ہوئے یاقوت کی مہکار ہیں
اس کی گردن جیسے مینائے شراب
اس کے نازک ہاتھ جیسے باغ میں رنگیں گلاب
بال اس کے کالی مخمل کا حسیں انبار ہیں
دانت جیسے موتیے کا خوبصورت ہار ہیں

یہ بھنویں ہیں یا گھٹائیں جھوم کر آئی ہوئیں
اور پلکیں کوہِ غم کو چوم کر آئی ہوئیں
پیٹ مرمر کی تراشیدہ چٹان
ناف سکھ کے نشے میں سویا مکان
ساق پورے چاند کی پہلی سریلی تان ہے
سینۂ شیریں شہد میں ڈوبا ہوا پیکان ہے
اسکی ریشم سی کمر کھاتی ہے بل وقتِ خرام
اس کے کولہے دیکھنے والی نگاہوں کے ہیں تنگ دام
اس کی رنگت شرم سے گلنار ہے
اس کا ہر جذبہ ہوائے عشق سے سرشار ہے!

اور آج شب مشعل کی روشنی تمہاری آواز' نظم کے مصرعے، سماعت سے سر ٹکراتی مصرعوں کی بازگشت، یہ رات، میری تکمیل کی رات، کہاں رہ گئے تم۔ دیکھوتو، میرے ہاتھ سرد رنگین گلاب، پلکیں کوہِ غم کو چوم رہی ہیں، تم نہیں ہو، کیا واقعی تم نہیں ہو؟

سرکتی رات کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ سرکا کر چاند کو دیکھا۔ کٹے پھٹے بادلوں کے درمیان وہ تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ وہ اسے پکڑنا چاہتی تھی۔ اس نے چاند کو ہپناٹائز کرنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ رات اس کے بدن میں سے گزرتی رہی اور وہ اسے نہ روک سکی۔ تم نہیں آئے اور رات کو روکنا میرے بس میں نہیں ہے۔۔۔!

آنسو اس کے گالوں پر نقش گری کرتے رہے۔ رات بھر آنسو گالوں کے نرم بستر پر اودھم مچاتے رہے۔ اور تھک کر سو گئے۔ جو آنسو جہاں سو گیا، اس نے اسے نہیں جگایا۔

رات کا آخری پہر تھا۔

اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ آتشدان کے انگاروں کی طرح۔ اس نے برش اٹھا کر پانی میں بھگویا لیکن واپس رکھ دیا۔ شاید وہ آجائے۔ اسے کسی مجبوری نے گھیر لیا ہو۔ لیکن رات کے آخری پہر میں وہ کیسے آسکتا ہے؟ انہونی۔۔۔ شاید۔۔؟ انتظار نے اسے چور کر دیا۔ چاند ڈوب رہا تھا۔ نیند اس کی پلکوں پر دستک دینے لگی۔ لیکن وہ تو کسی اور دستک کے انتظار میں تھی۔ وہ سونا

نہیں چاہتی تھی۔ باتھ روم میں جا کر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اسے ڈر تھا کہ آ کر لوٹ نہ جائے۔ وہ ادھوری رہ جائے گی۔ اور ادھورا پن اسے ساری عمر عذاب دے گا۔ وہ ادھورے پن سے خوفزدہ تھی۔ اس نے اسے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اس نے اپنے سارے رنگ اس کے نام کر دیئے تھے۔ اس نے ایک ایک لمحے کا حساب جوڑ رکھا تھا۔ وہ کب آیا، اس کے پاس کتنی دیر رکا۔ کتنے دن اس کے انتظار میں رائیگاں گئے۔ کس موقع پر کس رنگ کے کپڑے اس نے پہن رکھے تھے۔ اسے اس کے جوتوں کے رنگ اور شیڈ تک یاد تھے۔

وہ اسکی پینٹنگ کا بنیادی رنگ تھا۔ آج رات وہ نہیں آیا۔ اس نے میری معصوم سی خواہش کو کچل دیا۔ کتنا سفاک ہے وہ۔ میں اپنی بپتا کس سے کہوں؟ میں آج رات کا انتظار کیسے پینٹ کروں؟ اسے کون بتائے کہ میں ریزہ ریزہ ہو چکی ہوں۔

قالین پر بکھری پینٹنگز اٹھا کر اس نے پرزہ پرزہ کر ڈالیں۔ مگ اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ موقلم آتشدان میں جا پڑا۔ وہ باؤلی ہو رہی تھی۔ ہوش و حواس سے بیگانہ، بے خود، بے ترتیب اور بکھرے کمرے میں کھڑی وہ پاؤں پٹخ رہی تھی۔

IGNORANCE کا زہریلا نشتر اس کے بدن میں رینگ رہا تھا۔ اسے ذات کی نفی پاگل کئے دے رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دیوار پر لگی خزاں رسیدہ پینٹنگ اکھیڑی اور آگ میں جھونک دی۔ جل جاؤ، تم بھی اچھا ہے۔ تمہارے ساتھ اس کی آنکھیں لپٹی ہیں نا۔ آنکھیں بھی راکھ ہو جائیں۔ تمہیں کیا خبر؟ میں کن عذابوں سے گزر رہی ہوں۔

درختوں کے خطوط سپیدۂ سحر سے نمودار ہونے لگے۔ آتشدان سرد تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

رات کیوں نہیں آئے؟ اس کی آواز میں پوری رات کی چیخ تھی۔

میں تمہارے پاس موجود تھا۔

جھوٹ ۔۔۔۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

ذرا آئینے کے سامنے جا کر اپنے بدن پر ایک نظر تو ڈال کر دیکھو۔

ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ بدن کے خطوط کو غور سے دیکھا۔

ناف۔۔۔سکھ کے نشے میں سویا ہوا مکان
ساق۔۔۔پورے چاند کی پہلی سریلی تان
بالوں کو چھو کر دیکھا۔۔۔ریشم کے انبار
ہونٹ۔۔۔ہونٹوں پر اس کے لمس کی یاقوتی مہکار
بل کھاتی ریشم سی کمر۔۔۔سینہ۔۔۔شیریں شہد میں ڈوبا ہوا پیکان
اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔۔۔تراشیدہ چٹان
اس کی رنگت شرم سے گلنار ہو گئی۔
اس کے بدن پر پوری رات کے انتظار کی کیفیات پینٹ تھیں۔

ہے کوئی

کشادہ بازار کے پہلو میں اونگھتی تنگ گلی میں پندرہ بیش دکانیں سانس لے رہی تھیں۔ دکانوں میں مال زیادہ اور گاہک کم تھے۔ بازار سے اس گلی میں داخل ہوتے ہی اچانک ایسے محسوس ہونے لگتا ہے جیسے انسان کسی اور دنیا میں آنکلا ہے۔ یہ گلی اپنے وجود کے اعتبار سے ایک مکمل ریاست کی طرح تھی۔ دورویہ دکانوں میں اک دنیا آباد تھی۔ بھانت بھانت کی بولی سننے کو ملتی۔ ہر دکان دار کی اپنی ایک الگ دنیا تھی اور سب کی سوچ کا اپنا منطقہ۔۔۔۔۔ان ہی دکانوں کے بیچ ایک دکان مروت کی بھی تھی۔ جس میں بکنے کو کوئی چیز نہ رکھی گئی تھی۔ مروت گاہک بھی خود تھا اور دکان دار بھی۔ دکان میں نصب اکلوتے پنکھے کے پر اس کی قسمت کی مانند ساکت تھے ۔ پر جنبش کرتے نہ اس کا نصیب۔ وہ باہر کی تازہ ہوا کا منتظر رہتا۔ پنکھا صرف اس وقت چلایا جاتا جب کوئی گاہک آنکلتا۔ کیوں کہ بجلی کے کمرشل ریٹ کے نئے ہوش ربا ٹیرف نے پوری گلی کے اوسان خطا کر رکھے تھے۔ مروت دن بھر گلی سے گزرنے والی ریڑھیوں، سائیکلوں،

موٹر سائیکلوں اور پیدل گزرنے والوں کو تکتا رہتا۔ وہ ہر گزرنے والے کو پُر امید نظروں سے جانچنے کی سعی کرتا۔ مبادا ان میں سے کوئی میرا مقدر اپنی جیب میں لیے پھر رہا ہو۔

وہ علی الصبح جھاڑو لگا کر سیمنٹ کے تھڑے پر اپنی خستہ کرسی سجا دیا کرتا۔ دکان میں چھڑکاؤ کرتا۔ بالٹی بھر پانی کا چھڑکاؤ گرد بٹھانے کو گلی میں کر دیتا۔ سلائی مشین کی جھاڑ پونچھ کر کے تیل کے دو چار قطرے اسے پلا دیتا۔ دکان کے اندر نصب پڑچھتی پر فوم کے ٹکڑے ترتیب سے رکھتا، صوفوں سے اُترے ہوئے بوسیدہ کپڑوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے اس کے ذہن میں کئی خیالات اُترتے۔ وہ راتوں رات امیر ہونے کے خواب دیکھتا۔ لیکن ہر صبح غریب اٹھتا۔

اس کی دکان کے بالمقابل جلیل درزی کی دکان تھی۔ جلیل کی کمر نصف صدی سے کپڑے سیتے سیتے خمیدہ ہو گئی تھی۔ جلیل کے پاس آنے والے گاہکوں میں سے چند عمر رسیدہ گاہکوں نے اس کی دکان پر ''مجلسِ دانش وراں'' کی تختی آویزاں کر دی۔ شام سے ذرا پہلے ایک ایک کر کے دانش ور دکان میں اکٹھے ہونے لگتے۔ تھوڑی دیر بعد دکان سے مغلظات کا لاوا بہہ نکلتا۔ مروت سوچتا یہ کیسے دانش ور ہیں جو شام ڈھلے روزانہ اکٹھے ہوتے ہیں، اونچی آواز میں چیختے اور گالیاں بکتے ہیں۔ اخبارات کی خبریں چبا چبا کر دکان کے سامنے بہنے والی گندی نالی میں پھینکتے رہتے ہیں۔ اخلاق اور مروت سے عاری، نرمی اور ملائمت سے نا آشنا۔۔۔۔۔۔ یہ کیسے دانش ور ہیں؟ ان کے منہ سے ہر وقت خبروں کے بھبوکے اٹھتے رہتے ہیں۔ ملکی سیاست سے لے کر گلی میں سے گزرنے والی کالی چمارن تک کو یہ چبا جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہونہہ۔۔۔۔۔۔ دانش ور۔۔۔۔۔۔ اسے تو عورتوں کی مانند سر پر لٹکتی لٹوں والا دانش ور بالکل ہی نہیں بھاتا تھا جو ہر عورت کے گزرنے پر غیر ضروری خارش سے گزرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

جلیل درزی کی دکان کے پہلو میں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ لمبوترے چہرے اور تنگ ماتھے والا ایک شخص اونچی آواز میں دوہڑے، ماہیوں کی کیسٹ لگا کر چھ عدد کرسیوں کی روزانہ مرمت کرتا۔ ہوٹل اس کے ماتھے کی طرح تنگ اور لباس کی طرح میلا تھا۔ صفائی کرتے ہوئے میزوں کرسیوں پر میل کی تہہ صاف ہونے کی بجائے اور جم جاتی۔ دہی پر دن بھر باریک کپڑے کے باوجود مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ وہ مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے بے خبر اپنے خیالوں میں مگن اکڑوں بیٹھا جانے کیا گنگناتا رہتا۔ اکا دکا گاہک کے آنے پر دہی تولنے کے بعد وہ پھر اس آسن میں لوٹ

جا تا۔ اس کی دن بھر کی لاگت دہی کی تین پراتیں تھیں۔ کسی پیالی کی مٹھ سلامت نہیں تھی۔ چائے بناتے ہوئے وہ پتیلی میں پرانی پتی پھینٹتا رہتا۔ اسے دیکھ کر مکھیاں بھی کراہت محسوس کرتی تھیں۔ اس نے ایک دن مجلسِ دانش وراں میں قدم رنجہ فرمانے کی کوشش کی۔ اگلے دن اسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا گیا۔

اُلو کا پٹھا ۔۔۔۔۔ حرامی ۔۔۔۔۔ سارادن خصیئے کھجاتا اورانہی ہاتھوں سے چائے بناتا ہے۔ ایک دانش ور نے کہا۔

شکل دیکھی ہے اس ۔۔۔۔۔ مداری والے بندر کی طرح، چلا ہے دانش وروں کی مجلس میں دانش وری بگھارنے! وہ کٹورے میں دہی تولتے ہوئے سوچتا رہا، دانش ور چائے تو میرے ہاتھ کی پیتے ہیں، مجھے اپنے ساتھ بٹھانے میں انہیں کیوں عار ہے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ طبقاتی کشمکش اس نے دہی میں تول دی اور خود اونچی آواز میں دوہڑے سننے لگا۔

جلیل درزی کے بائیں جانب ایک ڈسکو نائی کی دکان تھی۔۔۔۔۔ اس گلی میں صبح جھاڑو لگانے کے بعد دکان دار سب پہلا کام یہی کرتے کہ اپنی اپنی کرسی سجاتے اور دن بھر دکان داری کم اور نظر بازی زیادہ کرتے۔ نائی بھی اپنے اوزار سجانے کے بعد بال سنوارتا۔ ٹیپ ریکارڈر میں جھنکار والی کیسٹ ڈال کر باہر کرسی پر آبیٹھتا۔ اسے دن بھر سرخ ساٹن کے پائینچوں سے جھانکتے کالی چپی میں دھرے سفید پاؤں کا انتظار رہتا۔ آئینہ اس نے ایسے رخ لگایا تھا کہ گلی کی نکڑ سے وہ جیسے ہی داخل ہوتی اس پر نظر پڑتے ہی ایک مکروہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں تلے اٹھلاتی، گھنی مونچھوں میں ناچتی کودتی ۔۔۔۔۔ شیو بناتے ہوئے استرے پر صابن کی جھاگ لیے وہ سیٹی بجاتے ہوئے دکان سے نکلتا۔ نالی میں جھاگ پھینکتا اور لوٹ کر گنگناتے ہوئے گاہک کے چہرے پر پھٹکڑی ملنے لگتا۔

جس روز مروت کی دکان سے دو دکانیں چھوڑ کر ڈینٹل کلینک کھلا سب دن بھر اپنی بتیسیاں آئینے میں دیکھتے رہے اور گلی میں نئی دکان کھلنے پر مفت معائنے کو اپنا حق جانتے ہوئے ڈاکٹر سے ہنس ہنس کر ملتے رہے۔ گلی میں ڈاکٹر کی روزی بھی چل نکلی۔ مریض کو کرسی پر لٹا کر وہ اس کا معائنہ کرتا۔ چھ انچ کے فاصلے سے جھانکتے ہوئے بلب کی زرد روشنی میں معائنہ کرنے کے بعد

وہ ہاتھ جھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹتا اور کہتا:

''برباد ہو گئے جی۔۔۔۔۔ مکمل برباد۔۔۔۔۔ کچھ نہیں رہا دانتوں میں۔۔۔۔۔ یہ تو Denture بنانا ہوگا۔۔۔۔۔ ماپ لیں گے۔۔۔۔ دو سیٹ لگیں گے۔۔۔۔۔ نہیں تو موجود دانتوں کا بھی اللہ حافظ ہے۔ معاوضے کا سن کر اکثر گاہک کرسی سے اُتر کر کھسک جاتے۔۔۔۔۔ ہوا کا رخ پہچان کر اس نے معاوضہ کم کرنا شروع کر دیا۔۔۔۔ تو دکان میں رونق بڑھنے لگی۔ وہ چوڑے ماتھے والا ایک شریف النفس انسان تھا۔ اسے کبھی کسی نے کوئی چھچھوری حرکت کرتے نہیں پکڑا۔ وہ اجلے کپڑے پہن کر آتا اور بے داغ لوٹ جاتا۔

ایک دن جب سورج کی حدت دکانوں کے آگے لگے ٹین کے چھجوں سے اُتر کر دکانوں اور دلوں میں اُتر رہی تھی، سہ پہر گزار کے ڈاکٹر نے جلیل درزی کی دکان میں قدم دھرا۔ جلیل نے ٹھنڈے سادہ پانی اور چائے سے اس کی تواضع کی۔ ایک ایک کر کے حسبِ معمول دانش ور اکٹھے ہونے لگے۔ اسی شام متفقہ رائے کی روشنی میں انھوں نے ڈاکٹر کو مجلس کی رکنیت دے دی۔۔۔۔۔ جب دانشوروں نے ڈاکٹر کو اظہارِ خیال کو کہا تو ڈاکٹر نے کھنکار کر گلا صاف کیا ۔۔۔۔۔ مایہ لگے سوٹ کی سلوٹوں پر ایک نظر ڈالی۔۔۔۔۔ عینک کے شیشے صاف کیے اور کہا ۔۔۔۔۔ ہمیں گلی کے مسائل حل کرنے کے لیے اور اسے منظم طریقے سے چلانے کے لیے ایک ایسا نظام وضع کرنا چاہیئے جو ساری مشکلات کے حل میں معاون ثابت ہو۔ ہمیں جمہوری طریقِ کار کو اپناتے ہوئے پوری گلی سے رائے لے کر صدر، سیکرٹری اور دیگر عہدیداران کا چناؤ کرنا چاہیئے۔

فر۔۔۔۔۔ ہم جو چاہے کرتے پھریں۔۔۔۔۔ ایک دانش ور نے قہقہہ لگایا۔

اوئے فتنے۔۔۔۔۔ بیچ میں مت بولا کر۔۔۔۔۔ دوسرا بولا۔

آخر کار ایک دن مجلس کا قیام عمل میں آ گیا۔ ووٹ تولنے کی بجائے گن لیے گئے۔۔۔۔۔ ایسا گھن چکر چلا کہ وہی دانش ور عہدوں پر متمکن ہو گئے اور گلی کے سیاہ وسفید کے مالک ٹھہرے۔ گلی والے مطمئن تھے کہ کوئی مسئلہ تو حل ہوگا۔ جلیل درزی بھی خوش تھا کہ نصف صدی سے سلائی مشین کی ہتھی گھماتے گھماتے اس کے ہاتھ کی لکیریں ہی گھس گئی ہیں، اب بھلے سے سلائی مشین کو موٹر لگ جائے گی۔۔۔۔۔ اللہ کرے گا میرے دائیں ہاتھ کی لکیریں دوبارہ ابھر آئیں گی۔ یہ بھی

طے پایا کہ ہر مہینے مجلس کا اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوا کرے گا تاکہ مسائل سے آگاہی رہے۔

اسی دوران گلی کے آخری سرے پر دو نئی دکانیں کھل گئیں۔ایک دکان پر بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے لہلانے لگے، دوسری پر بچوں کے کھلونے اور اسٹیشنری کی چیزیں گاہکوں کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔جس روز ان دکانوں میں روزی کا در کھلا، ایک دانش ور نے کہا۔۔۔۔۔گلی کی شمالی سمت والی دکانوں میں آسیب ہے۔ان میں کوئی ایک ماہ سے زیادہ ٹک ہی نہیں سکتا اور اکثر ہوا بھی یہی۔۔۔۔۔ شمالی سمت دونوں اطراف کی چار چار دکانیں طوائف کی طرح گاہک بدل لیتیں۔جب مروت نے دکان لی تھی تو اسے بھی جلیل درزی نے یہ دکان لینے سے منع کیا تھا اور بلا کر سمجھایا تھا کہ یہ دکان مت لو۔اس کی بنیادوں میں کالے بکرے کی سری دفن ہے۔۔۔۔۔

مروت حیرت سے جلیل درزی کا کالا سر دیکھتا رہا تھا۔وہ سوچنے لگا تھا کہ جب وہ نیا نیا یہاں آیا تھا تو اسے کتنی پزیرائی ملی تھی، نائی نے اس کی شیو اور بال مفت تراش دیئے تھے۔ہوٹل والے نے لسی کے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ڈاکٹر نے اس کی کھوکھلی داڑھ مفت میں نکال دی تھی، لیکن جلیل درزی نے سوٹ کی سلائی پوری لی تھی اور گن گن کر نوٹ اپنے سلوٹ زدہ کُرتے کی بغلی جیب میں ڈالے تھے۔۔۔۔۔اسے بکرے کی کالی سری سے خوف آنے لگا۔

مروت نے ایک بڑے شہر سے صوفوں کے کشن، پردوں کی سلائی اور کاروں، موٹر سائیکلوں کے سیٹ کورز کی ڈیکوریشن کا کام سیکھا تھا۔وہ بھالو، اونٹ اور ہاتھی بنانے کے فن سے بھی آشنا تھا۔اس کے ہاتھ میں نفاست تھی۔بڑے شہر میں اس کے بھالو، اونٹ اور ہاتھی بہت اچھی قیمت پر نکل جایا کرتے تھے۔لیکن دکان کا مالک آٹے میں نمک کے برابر معاوضہ اس کی ہتھیلی پر رکھتا تھا۔اس نے بھی یہ سوچ رکھا تھا کہ جب بھی اپنا کام الگ شروع کرے گا، ایسی چیزیں بنانے سے اس پر بابِ رزق کھل جائے گا۔

اس نے یقینِ کامل سے دکان کھول کر نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔شروع کے دنوں میں اسے پچاس کرسیوں اور صوفوں کے کشن کا کام ملا تو اس نے اپنے اندر مستقبل کی نامعلوم خواہشوں کے دیپ جلا لیے۔وہ پُرامید تھا لیکن مہنگائی کی وجہ سے گاہک اب کم ہی گلی کا رُخ کرتے تھے۔ دوسرے مہینے وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔اس کا یہ بھی یقین تھا کہ میرے مقدر کی بنیادوں میں کہیں کالے بکرے کا سر نہیں ہے۔وہ جنات، بھوت پریت،

آسیب اور سایوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس کا اللہ پر کامل یقین تھا۔ بچپن سے سویرے اٹھنا اس کا معمول رہا، کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ صبح کا سونا رزق کم کرتا ہے۔ اسے رزقِ حلال کمانے اور کھانے کی تعلیم ماں نے گھٹی میں دی تھی۔ وہ بڑی بڑی مارکیٹیں، چمکتی دمکتی دکانیں، صرافہ بازار سے گزرتے ہوئے سونے کی چمک دمک، نئے ماڈل کی ایک سے ایک کار دیکھ کر سوچتا کیا یہ سب اکلِ حلال سے ممکن ہے؟ دولت کہاں سے آرہی ہے ۔۔۔۔۔؟ کالا دھن کیسے سفید ہوتا ہے؟ لاینحل سوالات اسے الجھا کر رکھ دیتے اور وہ پھر اپنی ڈگر پر چل نکلتا۔

جب بہت دنوں مندا رہا تو اسے جلیل درزی کی بات ڈسنے لگی۔ سر بہ زانو واہمے اس کے اندر ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ اس نے کتنی ہی آیات کا ورد کیا، لیکن ایک نامعلوم سا خوف اس کے ذہن میں رینگنے لگا۔۔۔۔۔ ایک صبح اس نے دکان کھولی تو ایک عفریت کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ سہم گیا۔ عفریت انگڑائی لے کر بیدار ہوا اور دکان میں گھومنے لگا۔ پنکھے کے پر ساکت تھے۔ وہ کرسی پر بیٹھا آنکھوں میں خوف سمیٹے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔۔۔ اس نے آیت الکرسی کا ورد تیز کر دیا۔۔۔۔۔ عفریت غائب ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اسے پنکھے کے پروں سے چمٹا نظر آیا۔ اس نے اٹھ کر بٹن دبانا چاہا کہ پروں ہی میں وہ کٹ کر مر جائے لیکن تاروں میں حرارت ہی نہ تھی۔ دو ماہ سے بجلی کا بل ادا نہ کرنے کی وجہ سے لائن مین کا بے رحم پلاس تاریں کاٹ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ عفریت اس پر حملہ آور ہوتا، وہ دانش وروں کے پاس آ بیٹھا۔

دانش ور اخبار سامنے پھیلائے قہقہے لگا رہے تھے۔ وہی خبریں چبانے کا ایک سا عمل ۔۔۔۔۔ دہشت گردی، خوف، گینگ ریپ، قتل، اغوا، زنا بالجبر، مہنگائی، بدامنی، اغوا برائے تاوان، مسجد کے صحن میں نمازیوں کی لاشیں، بس اور ٹرین میں دھماکے، نسلی تعصّبات ۔۔۔۔۔ وہ سوچنے لگا لوگ اخبار کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں ۔۔۔۔۔؟ اخبارات ہمیں کیا دے رہے ہیں، بے چینی، خوف وہراس، مستقبل کے اندیشے، بے چینی کی فضا ۔۔۔۔۔ کیا ۔۔۔۔۔ کیا ۔۔۔۔۔؟ ایک کیڑا اخبار کی سطور میں رینگنے لگا ۔۔۔۔۔ پھر اس نے لاتعداد کیڑے رینگتے دیکھے ۔۔۔۔۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ دانش ور اخبار کی بجائے اس کا چہرہ پڑھ لیتے وہ وہاں سے اٹھ آیا۔ ہوٹل والے سے ایک کپ چائے کا کہا اور بوسیدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کو

دیواروں پر خوف رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ چائے کی پیالی میں پتی دیکھ کر وہ کانپنے لگا۔۔۔۔۔اتنی چیونٹیاں، کہیں یہ بھی زہریلی نہ ہوں۔۔۔۔۔ میں مرنہ جاؤں۔۔۔۔۔ وہ نائی کے پاس گیا، اخبار الٹ پلٹ کر دیکھا۔۔۔۔۔رنگین تصاویر سے خون بہنے لگا۔۔۔۔۔دہشت اس کی رگوں میں بیٹھنے لگی۔۔۔۔۔آخر میں جاؤں کہاں۔۔۔۔۔؟ جائے اماں ملے گی کیا۔۔۔۔۔؟ مگر کہاں۔۔۔۔۔؟ دکانوں کے باہر لٹکتے کھلونے چیخ رہے تھے، کھلونوں کے پیٹ پھول گئے تھے اوران سے پیپ بہہ رہی تھی۔۔۔۔۔اس نے گلی میں موجود دکان داروں اور دانش وروں کو بتلانا چاہا کہ اخبارات میں زہریلے کیڑے رینگ رہے ہیں، رنگین تصاویر سے لہو بہہ رہا ہے۔عفریت گلی میں گھس آیا ہے۔کھلونوں کے پیٹ سے پیپ بہہ رہی ہے۔لیکن وہ چپ رہا۔۔۔۔۔روسکا نہ چیخ۔۔۔۔۔آنسو حیران پتلیوں میں پھرتے رہے اور چیخ ہونٹوں کے مرقد میں دفن ہوگئی۔۔۔۔۔اس ڈر سے کہ لوگ اسے پاگل کہہ کر پتھر نہ مارنے لگیں۔۔۔۔۔وہ چپ رہا۔۔۔۔۔

مروت کو ابھی بہت سے کام کرنے تھے۔ بڑی بہن عمر کی اس دہلیز پر کھڑی تھی جہاں رشتے آنا بند ہوجاتے ہیں۔ آنگن میں اس کے ساتھ سٹاپو کھیلتی لڑکی جوانی کے دروازے میں ایستادہ اسے پُرامید نظروں سے تک رہی تھی۔ اسے کتنے ہی کام کرنے تھے۔ اپنا مستقبل سنوارنا تھا، بہن کی شادی کرنی تھی۔اسے زندہ رہنا تھا اور اپنے حصے کا رزق تلاش کرنا تھا۔اسے معلوم نہیں تھا، اللہ کی بجائے لوگوں نے رزق کی تقسیم اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔وہ سورج، چاند، ستاروں اور سمندروں پر قابض ہوکر روشنی اور پانی کا بیوپار کرنے لگے ہیں۔

وہ اپنی دکان پر آ کر بیٹھ گیا۔اس نے فیصلہ کیا کہ اگلے مہینے دانش وروں کی مجلس کے اجلاس میں اپنا مسئلہ ضرور اٹھائے گا۔وہ انہیں آگاہ کرے گا کہ ایک عفریت گلی میں گھوم رہا ہے۔اس کا سدّ باب کیا جائے۔ وہ گھروں کی دیواروں، چھتوں اور آنگنوں میں اُترتا اور خوف پھیلاتا رہتا ہے۔ اب وہ گلی کی ہر دکان میں مکین ہورہا ہے۔ وہ گلی، گلی میں موجود دکانوں اور انسانوں کو ہڑپ کر جائے گا۔

اجلاس میں اس کی بات کو سگریٹ کے دھویں میں اڑا دیا گیا۔دانش وروں نے اس کے خوف کو رد کرتے ہوئے اسے اس کا ذہنی عارضہ قرار دیا۔کیوں کہ ان میں سے کسی کے گھر، دفتر، کھیت کھلیان یا دکان میں آسیب نہیں اُترا تھا۔ڈاکٹر نے مروت کی بات پر توجہ دینے کو کہا کہ ممکن

ہے اس نے وقت کی نبض پہچان لی ہو۔ ہمیں کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔۔ کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے سے بلی معدوم نہیں ہو جاتی۔ وہ ایک اٹل حقیقت کی طرح موجود رہتی ہے اور تر نوالہ کبوتر ہی بنتا ہے۔۔۔۔۔

نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا۔۔۔۔۔

ہوٹل والے نے ہمت کر کے کہا۔۔۔۔۔ مروت کی بات کو وزن دیا جائے، نہیں تو ہم ہڑتال کر دیں گے۔ اوئے۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔۔۔۔۔ تجھے بھی زبان مل گئی۔۔۔۔

بات بڑھنے لگی۔۔۔۔۔ ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔۔۔۔۔ اس تُو تکار میں دانش ور آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔۔۔۔۔ وہ اودھم مچا کہ الامان والحفیظ۔۔۔۔۔ مروت سوچتا رہا یہ کیسے دانش ور ہیں۔ ان کو تو گلی کی قسمت سنوارنی تھی۔۔۔۔۔ یہ آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔۔۔۔۔ انہیں کون سمجھائے۔۔۔۔۔؟ کون عقل دلائے۔۔۔۔۔؟ یہ تو فیصلے کرنے والے لوگ ہیں، ان کا فیصلہ کون کرے گا؟

بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا گیا۔ لمحوں میں یہ خبر گلی کی ریاست سے نکل کر بڑے بازار سے ہوتی ہوئی پورے شہر میں گردش کرنے لگی۔ جس نے سُنا، انگشت بدنداں رہ گیا اور کفِ افسوس ملنے لگا۔۔۔۔۔

مروت بوجھل قدموں سے اپنے دکھ اور مسائل کاندھوں پر اٹھائے دکان پر آن بیٹھا۔ کیا کبھی کوئی آئے گا۔۔۔۔۔؟ ابنِ مریم۔۔۔۔۔ اذنِ مسیحائی لے کر اور یہ بوجھ ہمارے کاندھوں سے اتارے گا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ گلی کی نالی سے تعفن اٹھ رہا ہے، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔۔۔۔۔ پہروں بجلی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ہوش ربا گرانی میں سانس کی گھٹن، یہ سارے مسائل کون حل کرے گا۔۔۔۔۔؟ کون۔۔۔۔۔ کون کون۔۔۔۔۔؟ مروت کے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔۔۔۔۔

وہ گلی میں گزرتے چہروں پہ پیوست یبوست زدہ تحریریں پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیا یہ چہرے زندہ ہیں۔۔۔۔۔؟ ان پر مردنی کی سی کیفیت کیوں چھائی ہے۔۔۔۔۔؟ خوف کاشت کرنے والے ہاتھوں کو قلم کیوں نہیں کر دیا جاتا۔۔۔۔۔؟ وہی ذہن کے پردوں

پر رینگتا لامتناہی سوالات کا سلسلہ۔۔۔۔۔!

ان پردوں کی سلائی کرنی ہے۔۔۔۔۔

وہ ایک دم چونکا۔۔۔۔۔نقاب سے مسکراہٹ چھلکی۔

جی۔۔۔۔۔!

لیکن ذرا جلدی کیجیئے گا۔ اگلے ہفتے میری چھوٹی بہن کی شادی ہے۔

فکر مت کیجیئے۔۔۔۔۔ انشاءاللہ کام سولہ آنے اور ستھرا ہوگا۔

مروت نے مشین کی ہتھی گھمائی۔ سوئی کے ناکے میں دھاگہ ڈالا۔ پنکھے کے پر ہلنے لگے اور وہ اپنے کام میں مگن ہوگیا۔

نائی نے اسے سلام کیا تو وہ چونکا۔ کیوں کہ نائی پہلی بار اس کی دکان پر آیا تھا۔ اس نے نائی کے لیے چائے کا کہا۔۔۔۔اور اپنے کام میں کھو گیا۔۔۔۔۔

بادشاہو۔۔۔۔۔خیر تو ہے۔۔۔۔۔آج بڑی محنت سے کام ہو رہا ہے۔۔۔۔۔

یار شادی سے پہلے پہلے یہ پردے تیار کر کے دینے ہیں۔

کس کی شادی سوہنے او۔۔۔۔۔مکھناں والے او۔۔۔۔۔

گاہک تھی کوئی۔۔۔۔۔میں جانتا تو نہیں۔

پر۔۔۔۔۔ہم تو جانتے ہیں نا، جی۔۔۔۔۔مروت۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔۔مونچھوں تلے شیطانی مسکراہٹ کسمسائی، مغز نہ چاٹو، جاؤ اپنا کام کرو۔

کام تو ہوتا رہے گا، نا۔۔۔۔۔میری مانو تو اسے یہ مفت میں سی دو۔۔۔۔۔

کیوں بھلا۔۔۔۔۔؟

پھر وہ تمہیں موج کرائے گی۔۔۔۔۔

مروت کو نائی سے گھن آنے لگی۔۔۔۔۔لیکن نائی کی زبان استرے کی طرح چلتی رہی۔

اوئے بادشاہو۔۔۔۔۔وہ تو گوشت اسی طرح لیتی ہے موج کرا کے۔۔۔۔۔ایک بار اس پر مرغی والے کا ادھار چڑھ گیا، جب ادھار بہت زیادہ ہوگیا ناں جی، تو مرغی والا غصے سے لال پیلا ہوگیا۔۔۔۔۔وہ مرغی والے کو ساتھ لے گئی اور سارا ادھار اتار دیا۔ وہ تو کپڑے مفت سلواتی ہے اور وہی اس کے گھر پہنچ جاتی ہے۔۔۔۔۔اس کے بچوں کی حجامت میں گھر جا کر مفت ہی بنا

آتا ہوں، حرج ہی کیا ہے۔۔۔۔۔؟

مشین رُک گئی، پنکھا ساکت ہوگیا، کونے میں سر بہ زانو عفریت نے انگڑائی لی۔ مروت کا رنگ لٹھا ہوا۔ بہت سے سؤر اور کتے اس کی دکان میں گھس آئے۔ ان کی رال ٹپک رہی تھی۔ سؤروں اور کتوں نے پردے پھاڑ دیئے اور۔۔۔۔۔ وہ کئی سال سے یہ ٹکڑے لیے دکانوں پر گھومتا اور پوچھتا پھرتا ہے۔۔۔۔۔ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو ان ٹکڑوں کو جوڑ دے۔۔۔۔۔

ڈِنگ

بشارت احمد نے بستی خانقاہ سراجیہ کے ایک کھوکھے سے درجن بھر مالٹے خرید کیے۔ مالٹے نارنجی رنگ کے تھے۔ اس نے مونگ پھلی اور چلغوزے خریدنے کا بھی سوچا تھا۔ سیب اور کیلے خریدنے کا بھی اس نے ارادہ کیا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس کی نظر مالٹوں پر پڑی اسے اپنی گم شدہ اجڑی بستی کی آخری شام کی وہ نارنجی کرنیں یاد آگئیں جو اس نے اپنے صحن میں موجود کیکر کے درخت سے لپٹی دیکھی تھیں۔ وہ شام تھی کہ قیامت؟ اس کے گھر جیسا کہرام بستی کے ہر گھر میں

رقصاں تھا۔ سامان سمیٹا جا رہا تھا۔ ٹریکٹر ٹرالیوں اور ریڑھیوں پر لادا جا رہا تھا۔ بستی کے ہر شخص کے چہرے پر خاموشی کی دبیز تہہ تھی، چہرے تفکرات، اندیشوں اور مستقبل کے خوف کی دھول میں اٹے تھے۔ سب نامعلوم منزل کو رواں تھے۔ اس نے ایک بار پھر مالٹوں کو غور سے دیکھا۔

وہ رنگ بدل رہے تھے۔ پہلے وہ پیلے ہوئے، بالکل زرد اس کے چہرے کی مانند اور پھر ان میں سے خون رسنے لگا اس کے ارمانوں کی طرح! اس کا جی چاہا وہ انھیں پھینک دے۔۔۔۔۔

گھر پہنچ کر اس نے مالٹے میز پر رکھے۔

اس کے دماغ کے خلیوں میں بے شمار سوالات کے جراثیم پرورش پا رہے تھے۔ وہ سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ میری بستی کی آخری شام میرے اندر مر کیوں نہیں جاتی۔ اسے مر جانا چاہیئے۔ جب انسان گزر جاتے ہیں، تو یادیں آدمی کے اندر ساری عمر کیوں عذاب اگاتی رہتی ہیں۔ جیسے انسانوں کے جنازے اٹھتے ہیں، ارتھی اٹھتی ہے، ایسے ہی ذہن میں بھی کوئی سلسلہ ہوتا، یاد مر جاتی، دفن ہوتی اور کبھی لوٹ کر واپس نہ آتی۔ یادوں کی رو میں ایک وکیل کی جناح کیپ اس کی سوچوں کے لیے عذاب ہوگئی۔۔۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔۔۔ بالکل وکیل آیا تھا، بستی کا اکلوتا وکیل، شریف النفس اونچا دراز قد، شانے کشادہ، چہرے پر داڑھی، سر پر جناح کیپ، ہر دلعزیز، ملنسار، بستی کے لوگوں کا غم خوار۔۔۔۔۔ وہی وکیل۔۔۔۔۔ جب شام ڈھلے اس کے گھر آیا تھا تو اس لمحے اس کے والد کے آگے اس کی ماں نے کھانا پروسا تھا۔ تازہ سبز چنے کا سالن تھا۔ اس کا والد پگڑی سر سے اتار کر تکیے پر دھرے کھانا کھا رہا تھا۔ جب اسے وکیل کی آمد کی اطلاع کی گئی تو اس نے کہا۔

پُتر۔۔۔۔۔ وکیل صاحب کو بیٹھک میں بٹھا۔ میں کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔

بشارت احمد نے دیکھا اس کا والد عجلت میں لقمے نگل رہا تھا۔ ایسی کیا بات ہے؟ بابا کو جلدی کیوں ہے۔

اس کا بابا بیٹھک میں داخل ہوا تو چہرے پر خوف اور پسینہ تھا۔

وکیل صاحب کیا خبر لائے ہیں آپ۔۔۔۔۔؟

وکیل سرنیہواڑے اپنے پاؤں کے انگوٹھوں پر نظریں جمائے جناح کیپ گود میں رکھے چپ تھا۔ وکیل صاحب کچھ تو بولیے۔۔۔۔۔؟

ملک صاحب، حکومت نے بستی خالی کرانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ خبر یہ ہے کہ ایک بہت بڑا پراجیکٹ شروع کرنے کا منصوبہ جوزیرِ غور تھا، حتمی شکل پا گیا ہے۔ ہماری بستی ''ڈِنگ'' ہی نہیں ساتھ کا قصبہ ''کھولا'' بھی ۔۔۔۔۔! وکیل کی آواز بھرا گئی۔ بشارت احمد کا والد ملک فتح شیر چرچراتی چار پائی پر یوں بیٹھا جیسے شہتیر ٹوٹ کر گرتا ہے۔ بہت سی باتیں بشارت احمد کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ وہ عمر کی اس سرحد پر کھڑا تھا جہاں ہر طرف پھول کھلتے ہیں، رنگ بکھرتے ہیں۔ لیکن اس نے بھی آنے والے خطرے کی بُو سونگھ لی۔ وہ بھانپ گیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

ایک خوف پوری بستی میں سرایت کر گیا۔ اگلی صبح وہ گھر سے نکلا۔ اس نے دیکھا چھپر تلے مدھانی خاموش ہے۔ ماں آج لسی نہیں ملے گی ۔۔۔۔۔؟ چار پائی پر بیٹھی متفکر ماں سے اس نے پوچھا۔ لسی ۔۔۔۔۔؟ آج تو ماں نے بھینسوں کا دودھ بھی نہیں نکالا۔ اس کی بہن نے کہا اس نے بھینسوں کے ڈکارنے کی آواز سنی۔ تو ان بے زبانوں کو بھی معلوم ہوگیا ہے کہ بستی خالی کرائی جارہی ہے۔

اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں کوندا۔ پلٹ کر اس نے گھر کے در و دیوار کو دیکھا۔ کیوں نہ میں اپنے اس گھر کو اپنے اندر تعمیر کرلوں ۔۔۔۔۔! وہاں سے تو اسے کوئی بھی گرا کر اپنا منصوبہ شروع نہیں کر سکے گا۔ یہ خیال اسے اتنا بھایا پہلے اس نے سارے کمرے اپنے اندر تعمیر کیے۔ صحن میں لگے تلسی کے پودے کھرپے سے نکال کر اپنے اندر لگائے۔ چھپر بنایا، اس میں بھینسیں اور گائے باندھی۔ بکریوں کی چرنیاں تک اس نے ترتیب سے رکھیں۔ کیکر کا درخت لگانے میں اسے بہت محنت کرنا پڑی۔ کیکر کے ایک بڑے ٹہن پر لگا، رسے کا جھولا جو وہ ہر سال عید پر جھولا کرتے تھے، اسے بھی اس نے نظر انداز نہیں کیا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ پورا گھر ساز و سامان سمیت اس کے اندر تعمیر پا گیا ہے تو وہ سرشار ہوگیا۔ وہ گھر سے نکلا۔

گلی میں بنٹے کھیلتے بچوں پر اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے وہ اپنے کھیتوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ٹیوب ویل پر وہ جی بھر کے نہانا چاہتا تھا۔ ٹیوب ویل پر نہاتے ہوئے اسے خیال آیا۔ کیوں نہ اپنے گھر کی مانند اس پوری بستی کو میں اپنے اندر تعمیر لوں ۔۔۔۔۔! مالٹے اس کے سامنے دھرے تھے۔ وہ ماضی کی حویلی میں مقید تھا۔ اپنے وطن میں بستی تعمیر کرنے کا خیال اسے گھیرنے لگا۔ اگر میں بالکل اسی طرح ہمت کر کے پوری بستی اپنے اندر بسالوں تو شاید آنے والے زمانوں

میں یہ بستی دوبارہ آباد ہو جائے۔کوئی معجزہ یا کرامت۔۔۔۔۔!ٹیوب ویل پر نہانے کے بعد اس نے بستی کی گلیوں میں گھومنا شروع کر دیا۔ راستے ہی اس کے رازدار تھے۔ کچے کوٹھوں کی محبتیں اس کی امین تھیں۔

موضوعِ سخن ایک ہی تھا۔ کس نے کہاں جا بسیرا کرنا ہے۔لوگ منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اپنے تباہ شدہ گھروں کا ملبہ لے جانے کا سوچ رہے تھے۔ سب کے اذہان میں ایک ہی خوف پرورش پا رہا تھا کہ وہ جا کر جہاں بھی ٹھکانہ بنائیں گے وہ جگہ ''ڈِنگ'' نہیں ہوگی۔ دریائے سندھ کا مغربی کنارہ نہیں ہوگا۔ وہ کوئی اور بستی ہوگی۔ نیا نام، اسے اپنی پہچان کے لیے صدیاں درکار ہوں گی۔

بشارت احمد گھومتے گھومتے مہاجرین کے ڈیرے پر پہنچا تو پنچایت کا سماں تھا۔ فجر دین اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ باب الدین کو اپنی دکان کے علاوہ یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ مہاجرین کی نئی بستی کا نام کیا ہوگا۔۔۔۔؟

فجر دین نے بارعب آواز میں کہا ''بستی کے نام کی فکر نہ کھاؤ۔ میرے پوتے کے نام سے طاہر آباد موسوم کر لینا، ضرور بڑا آدمی بنے گا اور اس بستی کا نام روشن کرے گا۔ مکانوں کے ملبے کا سوچو، جو سوچنے کی بات ہے۔ یہ کیسے لے کر جانا ہے؟ اُجڑے تو سب کو ایک ہی جگہ جا کر آباد ہونا ہے نہیں تو ہم اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے۔

بالکل۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔۔۔ فجر دین نے ٹھیک بات کی ہے۔ تائید میں کئی آوازیں ابھریں۔ بشارت احمد ان کی باتیں سنتا رہا اور کڑھتا رہا۔ شیشم تلے رکھے مٹکے میں سے اس نے پانی کا کٹورا پیٹ میں اتارا۔ اس کے اندر جلن بڑھنے لگی۔ جیسے گیلی لکڑیاں سلگ رہی ہوں اور دھواں بے چین کر رہا ہوں۔ ان لوگوں کے قلوب میں بستی اجڑنے کا ملال کیوں نہیں ہے؟ یہ تو نئی بستی، نئے جہانوں کا سوچ رہے ہیں۔ یہ کل ہی کی تو بات ہے، دریائے سندھ کے کنارے گھوڑوں کی ''چیلی'' ہوئی ہے۔ فجر دین اور باب الدین بھی موجود تھے۔ نوجوان وکیل، قریشی خاندان کے افراد، پوری جمالے خیل برادری، امیر، غریب سب موجود تھے۔ چیلی بشارت احمد کا پسندیدہ کھیل تھا جس روز چیلی ہوتی، بھنوں مراثی ڈھول کی تھاپ پر ڈِنگ کی گلیوں میں ڈھول اڑاتا۔ چیلی کے انعقاد کا اعلان کرتا۔ اگلی صبح بستی کے بانکے سجے سجائے گھوڑوں پر بیٹھے اپنی

پگڑیاں اپنے دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے میدان کا رخ کرتے۔ گھوڑے دلکی چال چلتے، سم زمین پر مارتے، دھول اٹھتی۔ جوانوں کو ان کے ملازمین نیزے پکڑاتے۔ میدان کے بیچوں بیچ ایک نرم لکڑی گاڑ دی جاتی۔ بھنوں مراثی اپنے ڈھول کی طنابیں کھینچتا۔ ماما پھتن مراثی اپنی گلابی پگڑی سر پر اچھی طرح جما کر شہنائی منہ سے لگاتا۔ ڈھول کی تھاپ اور شہنائی کے سُر میں جانو مراثی کی بین کی آواز مستی گھولتی تو ڈِنگ کے پنڈال میں آئے ہوئے ہزاروں لوگوں کے چہرے گلنار ہو جاتے۔ سب کی نظریں میدان کے سرے پر کھڑے گھڑسوار پر ہوتیں۔ گھوڑا دھیمے دھیمے اگلے سم زمین پر مارتا، جوان نیزہ سنبھالتا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر ہزاروں نگاہوں کا مرکز بنتا۔ سرپٹ بھاگتے گھوڑے کی پیٹھ پر اپنے آپ کو سنبھالتا، جونہی زمین میں گڑی وہ لکڑی جو کھجور کی لکڑی سے تیار کی جاتی تھی، جسے چپلی کہتے تھے، کے قریب آتا تو گھوڑے پر پہلو کے بل جھکتا۔ جوان کا جھکنا، گھوڑے کا رفتار پکڑنا، بھنوں کا ڈھول پیٹنا، پھتن کی شہنائی اور جانو کی بین جب ہزاروں لوگوں کی تالیوں کی تھاپ شامل ہوتی تو جوان اپنی نگاہیں چپلی پر جمائے اور جھکتا، نیزہ چپلی کے سینے میں پیوست ہوتا اور جوان نیزہ فضا میں بلند کر کے خوشی کا نعرہ بلند کرتا اور دور تلک بھاگتے گھوڑے اور پنڈال کے شور میں عجب سرور اور سرداری کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ جب سورج ڈھلنے پر گھڑسوار لوٹتے تو گلیوں میں سے گزرتے ہوئے جیتنے والے جوان کو عورتیں دروازے کی اوٹ سے دیکھتیں۔ چوپالوں اور گھروں میں کئی دن تک چپلی کا تذکرہ رہتا۔

بشارت احمد کئی بار عالمِ تخیل میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ ڈھول کی تھاپ اور بانسری کی لے پر ہزاروں تالیوں کی گونج میں نیزے کی انی پر چپلی پروتا اور فخریہ سینہ پھلا لیتا۔۔۔۔۔ چپلی ۔۔۔۔۔؟

طاہر آباد میں چپلی کا کھیل تو نہیں کھیلا جائے گا۔۔۔۔۔

بشارت احمد اپنے خیالوں کے حصار میں چلتے ہوئے اس کچی آبادی کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں بھنوں مراثی کا دکھ بھی اس نے اپنے اندر بسانا تھا۔ وہ کچے کوٹھے کے اندر داخل ہوا۔ بھنوں مراثی حقے کی نے منہ میں دبائے دھواں پھیپھڑوں میں بھرتا کھانس رہا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی اور آنکھیں اس کی لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ بشارت احمد دیر تلک اس کے پاس بیٹھا رہا، چپ چاپ۔۔۔۔۔!

چاچا بھنوں کچھ بولے گا بھی۔۔۔۔۔؟ اس نے خاموشی کا قفل توڑا۔

پُتر! میں کیا بول سکتا ہوں؟ بولنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ ہمیں تو اپنے کچے کوٹھوں کا غم کھائے جا رہا ہے۔ پختہ گھروں والے تو اپنے ساتھ اینٹیں، گاڈر، ٹی آئرن اور ٹائلیں تک سمیٹ لے جائیں گے۔ ہمارا تو سب کچھ یہیں راکھ ہو جائے گا۔ ان مٹی کی دیواروں کو کہاں اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ چھت بھی گھاس پھونس کے ہیں۔ نیا گھر بسانے کو زمین بھی خریدنی ہے۔ سر چھپانے کو جانے کہاں جگہ ملے گی؟

چاچا غم نہ کھا۔۔۔۔۔ اللہ مالک ہے۔

وہ تو ہے پُتر، لیکن کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے مسئلہ حل تو نہیں ہو جائے گا۔ نئی جگہ پر ہمارے دھندے کا جانے کیا ہوگا؟ وہاں ہمیں کون پوچھے گا۔۔۔۔۔

اچانک بھنوں کی آنکھوں میں اک چمک سی لہرائی۔

بشارت پُتر پنڈی کیوں نہ ڈی ایس پی ملک خان محمد صاحب سے رابطہ کر لیں۔ شاید وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے بستی کو اجڑنے سے بچا لیں۔

بے سُود ہے چاچا۔۔۔۔۔ بہت اوپر یہ فیصلہ ہوا ہے۔

بھنوں کو اوپر والوں کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ اس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ وہ سوچتا رہا، جانے حکومتیں چھت کیوں چھین لیتی ہیں۔

بشارت احمد نے بھنوں کا کندھا تھپتھپایا اور اجازت لی۔ اس کی روح بے چین تھی۔ وہ بے منزل راستوں پر چلتا رہا۔ اس کے اندر اُگے سوالات کے جنگل میں آگ لگ گئی۔ اس آگ کو بجھانے والا کوئی بھی تو نہ تھا۔ وہ سوچتا رہا، لوگ نئی بستی بسانے کی تو بات کرتے ہیں۔ اس دم توڑتی ڈنگ کا نوحہ کیوں ان کے اندر دم توڑ گیا ہے۔۔۔۔۔؟ وہ سوچنے لگا جیسے انسان مرنے کے بعد اس دنیا میں لوٹ کر نہیں آتا، اسی طرح میری بستی بھی ہمیشہ کے لیے محکمہ مال کے کاغذات میں دفن ہو جائے گی۔ قیامت کے روز انسان کو تو دوبارہ زندہ کیا جائے گا لیکن میری بستی میں روح کون پھونکے گا۔ میں اللہ میاں سے کہوں گا ایک بار میری بستی، میری ڈِنگ زندہ کر دے میں اس کی گلیوں میں گھوم لوں، کیکر سے لپٹ لوں۔ ٹیوب ویل پر نہا لوں، چپلی دیکھ آؤں۔ احمد قصائی کی دکان سے بابا کے کہنے پر گوشت لے آؤں۔ بس ایک بار، میرے اللہ۔۔۔۔۔ میری بستی

۔۔۔۔۔! میں صابو نائی سے بال کٹوالوں۔ اس کے بیٹے خانو نائی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ اسے تو ابھی اوزار پکڑنے بھی نہیں آتے۔ میرے اللہ، میں اپنی بستی کی گلیوں میں شام ڈھلے گھروں کو لوٹتے ڈھور ڈنگروں کے گلوں میں لٹکتی گھنٹیوں کی آواز سن لوں۔ بس ایک بار بستی میں اپنا امر ڈال دے۔ اسے زندہ کر دے۔ میں تنور پر روٹیاں لگاتی اماں سمھو کے سامنے سے روٹی اٹھا کر بھاگ جاؤں۔ مجھے گھروں میں اپلوں پر ابلتے دودھ کی مہک اپنے اندر بسا لینے دے۔ دیکھ، تُو تو دعائیں قبول کرنے والا ہے۔ اربوں انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے والا ہے۔ بس ایک بار میرے اللہ میری بستی کو بھی زندہ کر دے۔ میں تیری منت کرتا ہوں، تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔۔۔۔۔

وہ رات گئے تک بستر پر لیٹا چھت کے ورگے اور لاڑیاں گنتا رہا۔ نئی بستی میں نامعلوم گھر کا خوف اس کے اندر رینگتا رہا۔ اسے دو چار روز پہلے کی ایک شادی کی تقریب یاد آ گئی۔ یہ رات یہ روایت بھی دم توڑ جائے گی۔ وہ اپنے قدآور بات ملک فتح شیر کے ساتھ ملک سکندر مستی خیل کے گھر پہنچا تو چھپر تلے کوندر کی گھاس بچھی تھی۔ چھپر تلے لوگ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اتنے میں مٹی کے پتروٹے ان کے سامنے چن دیئے گئے۔ ''مٹی کے کٹوے'' میں پکا ہوا لذیذ سالن ان کے سامنے رکھا گیا۔ ''لور'' پر لگی بڑی بڑی چپاتیاں جو پھتو کمہار اور میراں کمہاری نے اتاری تھیں۔ جوان لڑکے گلے اور کمر کے گرد کس کر کپڑا باندھے جھولا بنائے اس میں روٹیاں ڈالے باراتیوں کے آگے رکھ رہے تھے۔ کھانے کے بعد ''پتروٹوں'' میں حلوہ دیا گیا۔

وہ ساری رات تقریب کے دوران سوچتا رہا کہ جانے یہ لوگ کہاں جا آباد ہوں گے۔ ان سے پھر ملاقات کے سلسلے ہوں گے کہ نہیں۔۔۔۔۔؟

یہ مالٹے آپ بچوں کے لیے لائے ہیں۔۔۔۔۔ اس کی بیوی نے پوچھا۔

وہ ایک دم چونکا۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ اپنے لیے لایا ہوں۔

کیا مطلب ہے؟

آج میں ڈِنگ جا رہا ہوں۔

کیا مطلب ہے آپ کا۔۔۔۔۔ اس ویرانے میں؟

ہاں اسی ویرانے میں جہاں آبادی ہے۔

ہونہہ، آبادی۔۔۔۔۔! ان کھنڈرات میں حشرات الارض اور درندوں کا بسیرا ہے۔ میں

نہیں جانے دوں گی آپ کو۔۔۔۔۔

کچھ نہیں ہوگا۔

اس نے مالٹے اٹھائے اور چل دیا۔

وہ ڈِنگ والے پل کے آخری سرے پر پہنچا تو فوجی چوکی پر چوکس جوانوں نے اسے روکا۔

کہاں جانا ہے، آپ کو۔۔۔۔۔؟

اگر اجازت ہو تو میں اپنی اجڑی بستی دیکھنے جارہا ہوں۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ فوجیوں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ فوجی چوکی سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ڈِنگ کی حدود شروع ہوتی تھی اور پہلا گھر سکندر مستی خیل کا تھا۔

دو فرلانگ۔۔۔۔۔ صدیاں اس کے سامنے دیوار ہوگئیں۔ مالٹوں کا وزن ایک دم بڑھ گیا اور اس کے کندھے دکھنے لگے۔ چوتھائی صدی بعد وہ ان نارنجی کرنوں کی تلاش میں آیا تھا جو کیکے کی شاخوں میں اٹکی تھیں۔ اسے تو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ کیکر زندہ بھی ہوگا یا نہیں۔

کچی پگڈنڈی پر بشارت احمد نے قدم دھرا ہی تھا کہ اس کی مڈھ بھیڑ غلام علی ہلالی سے ہوگئی۔

بشارت احمد کہاں کا ارادہ ہے؟

یار۔۔۔۔۔ ڈِنگ جارہا ہوں۔۔۔۔۔ بشارت احمد عجلت میں تھا۔

وہاں تو کچھ بھی نہیں۔ جنگلی پڑ کیکر ہیں۔ حشرات الارض اور درندوں کا بسیرا ہے۔ ایک روز میں بھی گیا تھا۔ ہم ہلالیوں کے گھروں کی جگہ پر بھی اب کیکر ہی کیکر ہیں۔

غلام علی تمھارا گھر سکندر مستی خیل کے گھر کی دائیں جانب گلی میں مڑ کر ملک عطا محمد جمالے خیل کے گھر سے تھوڑا پہلے بائیں جانب ہی تھا۔۔۔۔۔

ہاں۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔ یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟

میں وہاں جاؤں گا، تمھاری ماں کے ہاتھ سے لسی پیوں گا، تمھارے بابا سے فصلوں کی کاشت پر تبادلۂ خیال کروں گا۔

بشارت احمد۔۔۔۔۔ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آؤ۔ وہ بستی خواب کی دھول ہوگئی۔ اب

تو ہم ہلالیوں کے گھر ہماری سوچ کی طرح بکھر گئے ہیں۔ قاسم ہلالی کا گھر ریلوے اسٹیشن کی شمالی سمت پانچ چھ گھروں کے درمیان اپنی تنہائی پر نوحہ کناں ہے۔ اس کا بوڑھا باپ غلام قادر گھنٹیا کا مریض ہے۔ وہ چارپائی پر اسیر، شیشم تلے بیٹھا ڈِنگ میں گزری زندگی کی یادوں کے سہارے زندگی جی رہا ہے۔ ہمارا گھر خانقاہ سراجیہ کی نئی آبادی میں اپنی پہچان کھو بیٹھا ہے۔ ملک حیات مرزے خیل نے ''چاہ مرزے والا'' کے نام سے موسوم جو بستی بسائی ہے وہاں بھی کچھ بے نام ونشاں ہلالی قوم کے افراد رہتے ہیں۔ غلام علی کی آنکھیں بھر آئیں۔ بشارت احمد سکندر مستی خیل کے گھر کے سامنے رکا۔ وہ جنگلی کیکروں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس نے اونٹ ڈکرانے کی آواز سنی۔ وہی اونٹ جسے تڑکے تڑکے سکندر مستی خیل جوت کر کھیتوں کا رخ کرتا تھا۔ کیا اونٹ یہاں نہیں ہے؟ جانور کہاں چلے گئے۔ ان بے زبانوں کا تو نام ونشان مٹ گیا۔ ہماری برادری جو مختلف شاخوں میں بٹی، پھر بھی یک جان تھی۔ جانے کون کہاں جابسا ـــــ؟ کتنے بھائی تھے ـــــ کتنے ـــــ؟ بشارت احمد نے ذہن پر زور دیا۔

ہمارے جدّ امجد ـــــ تین بھائی تھے۔ تلوکر خاندان انہی تین بھائیوں سے کتنا پھلا پھولا، بارآور ہوا۔ کوئی تو ان کا نام، ان کی تاریخ بھی محفوظ کر لیتا۔ کیا وہ صرف محکمہ مال کے کاغذات میں ہی ـــــ اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ بشارت احمد کے اندر جھڑی لگ گئی۔ جھڑی اور بارش ـــــ بارش جو کچے مکانوں کو کھا جاتی ہے، پختہ مکانوں کی بنیادیں کھوکھلی کر دیتی ہے۔ بشارت احمد کے اندر جھڑی لگ گئی۔ اُسے لگا، وہ زمین بوس ہو رہا ہے۔ نام اس کے ذہن میں بے ترتیب ہوتے چلے گئے۔ ملک مستی خان، ملک مرزا خان، ملک ہستی خان، تینوں شاخیں برگ وبار لائیں۔ ملک مستی خان کی اولاد مستی خیل کہلائی۔ اسی شاخ میں احمد خان نامی نوجوان نے سلسلۂ نقشبندیہ میں نام پایا اور سرخیل الاولیاء ہوئے۔ مولانا ابوالسعد احمد خانؒ ـــــ ریلوے اسٹیشن کی مشرقی سمت انھوں نے ایک بستی بسائی اور اپنے شیخ خواجہ سراج الدینؒ کے نام پر اس کا نام خانقاہ سراجیہ رکھا۔ ہستی خیل اسی بستی کی مشرقی سمت نہر کے اُس پار جا آباد ہوئے ـــــ ہم مرزے خیل ـــــ! ہمارا مرکز ڈنگ تھا۔ ہم بکھر گئے۔ میرے مرحوم چچا عطا محمد، غلام محمد، محمد شیر اور ماموں محمد افضل نے سامان ٹرالیوں پر لادا اور خانقاہ سراجیہ کی نئی آبادی میں ضم ہو گئے۔

دوست محمد نے چاہ مرزے والا جا ڈیرہ لگایا۔

بشارت احمد نے ایک مالٹا چھیلا۔ وہ تاریخ کا طالب علم نہیں تھا لیکن تلوکر خاندان کی تاریخ، افراد اور کردار اس کے اندر کروٹیں لے رہے تھے۔ وہ داہنی جانب گلی میں مڑا۔ ایک نیولا اسے سر اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔

وہ مسکرایا۔

یہ وہی نیولا ہوگا جو ہمارے گھر کیکر پر چڑھتے گلہری کو سر اٹھا کر دیکھا کرتا تھا۔ چوتھائی صدی پہلے بشارت احمد نے جو بستی اپنے اندر تعمیر کی تھی آج وہ اس کے دیوار و در سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے مرحوم چچا ملک عطا محمد کے چوبارے کی جگہ کو حسرت سے دیکھا۔ اسے ایسے لگا، اس کا چچا چارپائی کے پائے کے ساتھ تیتر کی تھیلی لٹکائے ہاتھ میں تیتر سنبھالے اسے سہلا رہا ہے۔ شیشم تلے تاش کے پتے بکھرے پڑے ہیں۔

اپنے گھر کی راہ لینے سے پہلے اس نے ''ڈیرہ فقیراں والا'' جانے کا فیصلہ کیا۔ ڈیرہ فقیراں والا ڈِنگ میں تقدس کی علامت تھا۔ وہ اپنی بستی کی اس مرکزی علامت کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ وہ ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلتا رہا۔ اس کے حافظے میں ساری یادیں، باتیں، دیوار و در، درخت، چرند پرند، مسجد کا لاؤڈ سپیکر، آٹے کی چکی کی ٹک ٹک کی دل کش آواز، حتیٰ کہ کچی راہوں پر ڈھور ڈنگروں کا گوبر بھی نہیں بھولا تھا جسے گاؤں کی غریب لڑکیاں اکٹھا کر کے سوکھ جانے پر بطورِ ایندھن استعمال کرتی تھیں۔

اس کے قدموں میں صدیوں کی تھکن تھی۔ اس کے وجود میں زمانے گم تھے۔ وہ چلتا رہا، بے سمت، بے آواز قدموں کے ساتھ۔ اسے شرینہہ کے درخت کی تلاش تھی۔ جس کے سائے کا پھیلاؤ دو کنال تھا۔ اس گھنے شجرِ سایہ دار کے نیچے فقیر محمد امیر سے لوگ ملنے کو آتے۔ جوق در جوق، قطار اندر قطار، بس ایک روحانی کشش انھیں کھینچ لاتی۔ لوگ اپنی باطنی تشنگی کی سیرابی کو اس چھتناور درخت کا رخ کرتے۔ فقیر محمد امیر کا سایہ شرینہہ کے سائے سے کہیں زیادہ گھنا، میٹھا اور آرام دہ تھا۔ لوگ دعاؤں کی سوغات سے مالا مال لوٹتے۔ مہمان نوازی اس گھر کے افراد کی گھٹی میں شامل تھی۔ بشارت احمد نے دور تلک نظر دوڑائی۔ شرینہہ کا وجود کہیں نہیں تھا۔ لیکن فضا میں ایک مہک تھی۔ ایک فقیر اور درویش منش انسان کے وجود کی مہک، بان کی چارپائی پر آلتی پالتی

مارے بیٹھے فقیر محمد امیر ـ ـ ـ ـ ـ! کُرتا ململ کا، تہمند باندھے چہرے پر کرنیں نور کیں، سادگی کا مرقع، عہدِ صحابہ کی یادگار، انہی چودہ سو سال پہلے کی محبتوں کے امین، مہمان نواز ایسے کہ امراء وغرباء کے ہاتھ خود دھلاتے، کھانا سامنے لاکر پروستے، ان کی باتیں سنتے غور اور توجہ سے، دکھ بانٹتے، دائیں ہاتھ سے ان کے کام آتے، بائیں ہاتھ کو خبر تک نہ ہونے دیتے۔

بشارت احمد چھپر تلے بیٹھا شرینہہ کے سائے کو سرکتے ہوئے دیکھتا رہا۔ شرینہہ کا سایہ نہیں اس کے سامنے وقت ڈھل رہا تھا۔ یا وہ خود ڈھل رہا تھا۔ لوگ ایک ایک کر کے جا رہے تھے۔ وہ تھا، فقیر محمد امیر تھے اور یاد کی تیز ہوا تھی، سب ریزہ ریزہ، کرچی کرچی ـ ـ ـ ـ ـ وہ لوٹنا چاہتا تھا۔ اس کی جھولی دعاؤں سے بھر گئی تھی۔ اس کے قدموں میں صدیوں کی تھکن اور دھول تھی۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔

اپنے گھر میں وہ ایسے لمحے داخل ہونا چاہتا تھا جب شام ڈھل رہی ہو اور نارنجی کرنیں کیکر سے لپٹ کر گرلا رہی ہوں۔ حکومت نے ہزاروں ایکڑ اراضی خالی کرالی تھی اور فیکٹریاں بہت دور مشرقی سمت تعمیر کی گئی تھیں۔ وہ سوچتا رہا اور چلتا رہا۔ اگر یہاں کچھ بھی تعمیر نہیں ہونا تھا تو مخلوقِ خدا کو کیوں اُجڑنے کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔

وہ اپنے ماضی کی تلاش میں اس اجڑے کھنڈر میں شاید کبھی نہ آتا لیکن جس روز خانقاہ سراجیہ، اس سے ملحقہ نئی آبادی، چاہ مرزے والا، سیفن پل، مافی والا، لال والا، سعید آباد، مدنی کے ڈیرے اور گردونواح میں پھیلے مکینوں میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ فیکٹریوں کے زہریلے اثرات کے پیشِ نظر ایک بار پھر قریب آباد ہو جانے والی بستیوں کو وہاں سے اٹھا لینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ ہولناک خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی اور بشارت احمد اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ کیا ایک بار پھر وہی عذاب ہوگا۔ فیصلہ بدل دینا کس کے بس میں تھا؟ جیسے بھنوں مراثی کو اوپر والوں کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا بالکل ویسے ہی ہر شخص بے بس اور مجبور تھا۔ اپنی سوچوں میں غلطاں و پیچاں بشارت احمد ''ڈیرہ فقیر والا'' سے جب راہوں کی دھول پھانکتا اپنی گلی میں داخل ہوا تو اس کے پاؤں من بھر کے ہو گئے۔ جیسے کششِ ثقل بڑھ گئی ہو۔ قدم اٹھانا اسے دوبھر ہو گیا۔ اس نے اجڑے مکانوں کی بنیادوں کو غور سے دیکھا۔ مکانات کی جگہ جنگلی کیکر اُگ آئے تھے۔ زرعی زمین جو حکومت نے ٹھیکے پر دے رکھی تھی، اس لیے جب وہ ٹیوب ویل پر پہنچا

تو ڈِ نگ انگڑائی لے کر اس کے اندر زندہ ہوگیا۔ ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ لمبے قد اور خشخشی داڑھی والا ایک بلوچ جس نے زمین ٹھیکے پر لے رکھی تھی، کھیتوں کو پانی دے رہا تھا۔

بشارت احمد کا دل بھر آیا۔

اس نے ٹیوب ویل سے ٹھنڈا میٹھا پانی پیا اور گھر کی طرف قدم بڑھائے۔ کانٹوں سے دامن بچاتے ہوئے وہ اپنے گھر کے صحن میں چوتھائی صدی بعد داخل ہوا۔ وقت تھم گیا۔ پرندوں نے پرواز روک لی۔ اسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ جانوروں کی چرنیاں جوں کی توں موجود تھیں۔ بس ان کا سیمنٹ اکھڑ گیا تھا اور اینٹیں کلرزدہ ہوگئی تھیں۔ چھپر کی بنیادوں کو اس نے غور سے دیکھا۔ تانبے کے ایک گلاس پر اس کی نظر پڑی، بالکل اچانک وہ چونکا، رویا اور گلاس اٹھا لیا۔ اپنے والد ملک فتح شیر کو یاد کیا، چھلکا اور چھلکا، یہ وہی گلاس تھا جس میں اس کا بابا لسی پیا کرتا تھا، شاید ماں سامان میں اسے ساتھ رکھنا بھول گئی۔ اس کا بابا اسے لڑکپن میں ہی حالات کے بے رحم دھاروں پر چھوڑ گیا تھا۔ اس نے گلاس سنبھال لیا۔ اسے بہت بڑی سوغات ہاتھ آ گئی تھی۔ گلاس اس کے ہاتھ میں تھا کہ اسے ماموں ملک محمد افضل کے گھر کی کھڑکیوں کے رنگین شیشے یاد آ گئے۔ لال، زرد، نیلے اور سبز رنگ کے شیشے، یادیں رنگین ہونے لگیں۔ اس کا ماموں بڑا نفیس الطبع شخص تھا۔ ململ کا سفید کرتا ان پر بہت سجتا تھا۔ دورانِ گفتگو اس کے ماموں انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کی چٹکی سے کُرتے کو کبھی کندھے اور سینے کے سامنے سے اٹھاتے، یہ ان کی خاص ادا تھی۔ رنگین شیشے کہاں گئے؟ اس کے ماموں کی طرح ماضی کو سدھار گئے۔

اس نے کیکر کے تنے پر ہاتھ رکھا تو رسے جھول کر پینگ ہوگئے۔ اس کا جی چاہا وہ جھولا جھولے۔ بابا سے عیدی لے۔ گاؤں کی ہٹی سے ریوڑیاں اور ٹانگریاں خریدے۔ ڈِ نگ کی گلیوں میں کھیلتے رنگ برنگے کپڑے پہنے بچوں کے ساتھ عید منائے، پٹھو گرم کھیلے، والی بال کا میچ دیکھے، چیلی کے انعقاد کا اعلان ہو اور وہ دریائے سندھ کے کنارے کا رخ کرے۔

وہ کیکر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ایک بار پھر اُجڑنے کا خوف اس کی رگوں میں اودھم مچا رہا تھا۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ وہیں بس جانا چاہتا تھا۔ انہی کھنڈرات میں، کیکروں کی چھاؤں میں اپنی جھونپڑی بسا لینا چاہتا تھا۔

وہ ایک پل کو سمیٹتا لوٹ رہا تھا تو ایک دوسرا پل اس کے سامنے پھیل رہا تھا۔ کاندھے جھکے

ہوئے تھے۔ کہولت نے اسے ایک آن میں آلیا تھا۔ گھر پہنچا تو شام ڈھل چکی تھی۔ ہر کہیں ملگجے اندھیرے میں سیاہی حلول کر گئی تھی۔ بستر پر دراز ہو کر اس نے آنکھیں موندلیں۔ یوں جیسے پھیلتا لمحہ اس طرح معدوم ہو جائے گا۔ مگر صدیوں کی تھکاوٹ اس کے بدن میں اترتی چلی گئی۔

رومنی

ٹرک چلا تو اس پر سامان اور مجھ پر یادیں لدی تھیں۔ میری کل متاع ایک بوسہ تھا۔ چلتے

ہوئے رومنی کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ کہیں یہ بوسہ گم نہ کر بیٹھنا۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔ میں اس بوسے کے سوا تمہیں اور دے ہی کیا سکی ہوں۔ مجھے ڈر ہے زندگی میں تم پر بوسوں کی بارش ہو تو کہیں تم اس اکیلے بوسے کو بھول نہ جاؤ۔ اسے بھول گئے تو رومنی کو بھی بھول جاؤ گے۔ کون کسے یاد رکھتا ہے؟ ٹرک موڑ مڑا تو آخری جھلک بھی جاتی رہی۔

میرے والد کو اپنا سفر مکمل کئے بہت برس بیت گئے تھے۔ ایک ہی بڑا بھائی تھا۔ والد کے بعد وہ چھتنار درخت ہو گیا۔ اس نے ہمیں دھوپ سے بچایا۔ تعلیم کے لئے بڑے بھائی نے مجھے شہر بھیج دیا۔ میں چچا احمد دین کے ہاں رہنے لگا۔ چچا لاولد تھے۔ صبح کے گئے، دفتر سے دوپہر میں لوٹتے۔ چچی سارا دن چھالیہ کترتے اور پان چباتے گزار دیتیں۔ اگر پڑوسن یا کوئی محلے دار آنکلتی تو پان چھالیہ کے ساتھ باتیں کرنے اور غیبت چبانے لگتیں۔ یہ گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ گھر سے گھر جدا ہونے کے ڈر سے جڑے تھے۔ گھر کی دیواریں اکثر سوچتی ہوں گی کہ ہم میں رہنے والے ہماری طرح کیوں نہیں رہتے، جڑے جڑے، ملے ملے۔۔۔ یہ کیوں اینٹ ہو جاتے ہیں۔ صدی کی آخری دہائی میں انسان بے حس اور مکان حساس ہو گئے تھے۔ مکان بھی نئی تہذیب میں ڈھل کر ماڈرن ہو گئے۔ بناؤ سنگھار کرنے لگے۔ زرق برق لباس پہننے لگے۔ لیکن انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔

سامنے کے مکان کا میک اپ قابلِ دید تھا۔ مکان ہر وقت بنا ٹھنا رہتا تھا۔ اس کے ماتھے پر گہرے لال رنگ کا جھومر تھا۔ کانوں میں سرو کے آویزے اور لباس سنوارتے کے لئے کتنے ہی ملازم تھے۔ انہیں مالک سے زیادہ مکان کی فکر رہتی تھی۔ میلا نہ ہو، اس کا لباس داغدار نہ ہو، کہیں کوئی دھبہ نہ لگ جائے، مکان کی دھلائی کے لئے جدید آلات، مشینیں اور کیمیکلز تھے۔

میں سوچتا ہوں، دل بھی تو مکانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان مکانوں میں کتنے لوگ بسیرا کرتے ہیں۔ ٹھہرتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ یادوں کی راکھ آتشدان میں چھوڑ جاتے ہیں۔ دل کی دیواریں بھی مکانوں کی طرح کمزور اور کلرزدہ ہو جائیں تو وہ زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرتا۔ مایوسیوں کی سیلن سے دل کا پینٹ اکھڑنے لگے تو وہ مکینوں کے لئے کشش کا باعث نہیں رہتا۔ رومنی کا دل بھی ایک گھر تھا۔ ایک مکان خالی اجاڑ، نہ باہر کسی کے نام کی تختی، نہ اندر کوئی رہتا تھا۔ جس گھر میں وہ رہتی تھی وہ بیسویں صدی کے آغاز کا سا سادہ، پُروقار اور خاموش سا مکان تھا۔ اس گھر میں ایک

اینٹ رومنی کے نام کی تھی۔

سبز پائنچے اور گلابی پاؤں پر میری پہلی نظر اس دن پڑی جب وہ شب برات کی شام چچی کو پلیٹ میں چاول دینے آئی۔ سبز پائنچہ اور گلابی پاؤں۔ مَیں کیمسٹری کے فارمولے اور فزکس کی Equation بھول گیا۔ سارے محلول گڈمڈ ہو گئے۔ جو بھی مکسچر تیار کرتا اس کے ہیولے ہی ہیولے تھے۔ عید قریب آ رہی تھی۔

دو مہینوں میں اس سے جو دو چار ملاقاتیں ہوئیں، وہ بھی اس گنجڑوں کی کہانی کی طرح ادھوری تھیں جو بچپن میں نانی اماں ہمیں بہلانے کے لئے سنایا کرتی تھیں۔ اس کے مکمل حسن کی طرح ایک بھی مکمل ملاقات ہو جاتی تو میں ایک بڑی کہانی بُن لیتا۔ رومنی کو تو اپنا سفر مکمل کرنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگی، جتنی دیر میں ہم اخبار کی بقیہ خبر صفحہ نمبر سات میں تلاش کرتے ہیں۔ پانچ کالمی سرخی سے ایک کالمی خبر بننے تک اسے دیر ہی کتنی لگی۔ وہ رومن حروف کی طرح تھی۔ لگتا تھا رومن حروف کی طرح زندگی میں متروک ہو گئی ہے۔

پہلی خاموش ملاقات اتنی سی تھی۔ چچی کے کہنے پر اس نے میرے کپڑے دھوئے، سوکھنے پر انہیں استری کیا اور خاموشی سے میری موجودگی میں صوفے پر رکھ کے چلی گئی۔ وہ آنے کے بہانے کسی کام سے آتی، منٹوں میں لوٹ جاتی۔ نہ بات نہ اشارہ، اس کا پورا وجود خاموش تھا۔ بدن بے آواز تھا۔ اس عمر میں تو بدن بولتے ہیں۔ لیکن رومنی کا بدن خاموشی کے برفاب تلے دبا تھا۔ اس کا رنگ مکھن اور شہد کی آمیزش سے بنا تھا۔

دوسری ملاقات بھی خاموش تھی۔۔۔

"چچی تنگ آ گیا ہوں میں۔۔۔۔ باتھ روم میں ٹونٹی اتنی اونچی لگی ہے کہ چھینٹے پڑتے ہیں۔"

"نیچے بالٹی رکھ لیا کر" چچی نے مشورہ دیا۔

"پُتر، آہستہ بولا کر، تیری چچی بہری نہیں ہے۔۔۔" چچا احمد دین نے ہنس کر کہا۔

"چاچا۔۔۔۔ دیکھ تو کتنے چھینٹے اڑتے ہیں۔ میں نے غصے میں پوری ٹونٹی کھول دی۔

اسی شام وضو کرنے کے لئے میں غسلخانے میں گیا تو پلاسٹک کے پائپ کا ٹکڑا لگا تھا۔ میں نے چوکی پر بیٹھ کر آرام سے وضو کیا۔ وضو کر کے زوردار نعرہ لگایا۔

"چاچی زندہ باد۔"

"کیا ہوا، چاچی کی اتنی تعریفیں ہو رہی ہیں۔"

"چاچی تو نے پائپ جو لگا دیا ہے۔"

"میں نے کب لگایا ہے؟"

"تو پھر۔۔۔۔؟"

"رومی لگا گئی ہے۔ کہہ رہی تھی، چچی کپڑے دھوتی ہوں تو چھینٹے پڑتے ہیں۔" یہ دوسری خاموش ملاقات تھی۔ تیسری ملاقات بھی خاموشی کے کفن میں لپٹی تھی۔۔۔

میں کیاریوں کی گوڈی کرنے میں مگن تھا۔ نئی کیاری بناتے ہوئے میں کھرپے سے مٹی نکال رہا تھا۔ وہ درخت کے تنے کا سہارا لئے خاموش کھڑی تھی۔ شرارتاً میں نے اس کے پاؤں پر مٹی ڈالی، وہ کھڑی رہی۔ میں مٹی ڈالتا رہا، پاؤں چھوٹی سی قبر نما ڈھیری میں چھپ گیا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ پلٹ گئی۔ اسی لمحے اس کا پاؤں علامتی قبر میں تھا یا حقیقی قبر میں۔ میں الجھنے لگا، وہ روئی کیوں؟ میں پانی پر لکھی تحریر کیسے پڑھوں۔ میں نے اس کے پاؤں پر مٹی کیوں ڈالی۔ کیا اس نے اپنی یادوں کا مرقد تو نہیں دیکھ لیا۔ وہ بول لیتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس نے آج تک میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ خاموش اقرار کے ساتھ میں کیسے جی پاؤں گا۔

پھر اسی رات میرے گھر میں قبر اگ آئی۔ قبر کا منہ کھلا تھا۔ سفید کفن میں لپٹے شخص کو میں نے خود قبر میں اتارا۔ کچی اینٹیں ترتیب سے رکھیں اور پھر کھرپے سے مٹی ڈالنے لگا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ کبھی وہ قبر بالکل چھوٹی ہو جاتی، کسی لمحے پھیل کر پوری زمین کو گھیر لیتی۔ تیز ہوا گرم تھی۔ قبر سے اڑتی مٹی میری آنکھوں میں پڑنے لگی۔ آنکھ کھلی تو حبس تھا۔ صبحدم جب دروازے پر دستک ہوئی تو میرا گھر قبرستان ہو گیا۔ گاؤں سے آنے والے ہرکارے نے بھائی جان کی موت کا پیام سنایا تو کہرام مچ گیا۔ چچی چھالیہ کترنا بھول کر دوہتڑ مارنے اور بین کرنے لگیں۔ چچا کی کمر اور جھک گئی۔ ہمسائے اکٹھے ہو گئے۔ مجھے اپنا ہوش نہ رہا۔ جب وہاں سے چلنے لگے تو اتنی بہت سی نمناک آنکھوں میں رومی کی سوگوار آنکھیں بھی تھیں۔ سفید لباس میں اس کے آنسو بول رہے تھے۔ پانی پہ لکھی تحریر میں نہ پڑھ سکا۔

بھائی کی تدفین کے بعد میں زندگی کی قبر میں تنہا رہ گیا۔ مسائل ناگن کی طرح پھن

پھیلائے کھڑے تھے۔ تین سوالوں کے بجائے کتنے ہی سوال تھے جن کا زندگی کی قبر میں مجھے جواب دینا تھا۔ پہلا فیصلہ یہی ہوا کہ چچا احمد دین گاؤں لوٹ آئیں اور کھیتی باڑی سنبھالیں اور میں ہوسٹل میں رہ کر تعلیم مکمل کروں۔ ایک ہفتہ بعد شہر سے سامان اٹھانے کے لئے انہوں نے مجھے بھیجا۔ میں وہاں پہنچا، تالا کھولا، گھر چپ اور اجاڑ لگ رہا تھا۔ مکان سے میرے حصے کی اینٹ نکل گئی تھی۔

دروازہ کھلنے اور سامان گھسیٹنے کی آواز پر رومنی آنکلی۔ کچھ کہے بغیر وہ سامان سمیٹنے لگی۔ اسٹور میں سے سامان نکالتے ہوئے اس نے مجھے چائے کی پیالی تھمائی۔ چائے میں وہ اتنی بہت سی باتیں گھول کے لائی کہ میں چائے بھول کر چائے کی بھاپ سے باتیں کرنے لگا۔

میں موجود رہوں گی۔ تمہارے آس پاس، اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہ کرنا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ پلاسٹک کا پائپ یونہی لگا رہے گا اور میں تمہیں دکھ کے چھینٹوں سے بچاؤں گی۔ میں بول نہیں سکی، میں اقرار نہیں کر سکی، لیکن مجھے یقین ہے تم نے میری چپ پڑھ لی ہوگی۔ وہ ساری باتیں اور وعدے جو میں نے تم سے کرنے کا سوچا تھا، تم نے میری آنکھوں سے پڑھ لئے ہوں گے۔ میری خاموشی نے تم سے کوئی اقرار نہیں مانگا پھر بھی چاہوں گی، پہاڑوں کے اس پار جب سورج ڈوبنے لگے، شام کے بعد تم میری یادوں کا چراغ ضرور جلایا کرنا۔ میں تمہاری یاد کے دالانوں میں اتنی شمعیں جلاؤں گی کہ چکا چوند ہو جائے گی۔ تم بس شام کے بعد اک دیا جلا دیا کرنا۔ وہ رات بھر ٹمٹماتا رہے۔ تمہیں میری یاد دلاتا رہے۔ میرے آنسو ساتھ لیتے جانا، دیئے میں تیل کا کام دیں گے۔ تم یہ نہیں کہہ سکو گے کہ میں چراغ کیسے جلاؤں۔ تمہارا بھائی چلا گیا میں تمہیں کیسے بتاؤں میں کتنا روئی ہوں۔ بتا بھی دوں تو کیا تمہیں یقین آجائے گا۔ جن کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہ ہو وہ یقین کہاں سے لائیں۔ میں نے تمہارا دکھ سمیٹنا چاہا، جی چاہا تمہیں اپنی کمزور بانہوں میں چھپالوں، تمہیں میرے سوا اور کوئی نہ دیکھے، لیکن میں کچھ بھی تو نہ کر سکی۔ تم خالی آئے اور خالی لوٹ رہے ہو۔ تمہاری زندگی میں جانے کتنی رومینیاں آئیں گی، تم مجھے کہاں یاد رکھ سکو گے، مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔

چائے کی پیالی میں باتیں سمندر ہو گئیں۔ میں ٹھنڈا ٹھار سمندر پی گیا۔ میرے ہاتھ میں شاعری کی ایک کتاب تھی، اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ تھا۔

یہ تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔

میں نے کتاب رومنی کو تھمائی۔ اس نے آنسو مجھے تھما دیئے۔

جانے مجھے کیا سوجھی، میں نے رومنی کے دونوں گالوں پر ہاتھ رکھ کر پیشانی چوم لی۔ چہرے کی حدّت سے میرے ہاتھ پگھل گئے اور ہونٹوں پر بوسے کا گرم ذائقہ پینٹ ہو گیا۔ وہ ایک بوسہ، ایک وعدہ، ایک یقین، ایک تحفہ جو ساری باتوں، سارے وعدوں پر بھاری تھا۔

ٹرک چلا تو اس پر سامان اور مجھ پر یادیں لدّی تھیں۔ میری کل متاع ایک بوسہ تھا۔ وقت کے لامتناہی صحرا میں زندگی برہنہ پا سائے کی تلاش میں بھٹکتی رہی۔ مسائل میں گھر کر میں نے اس اکیلے بوسے کو بھولنا چاہا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میں روزانہ باقاعدگی سے رومنی کے آنسوؤں سے چراغ تو نہ جلا سکا، لیکن اکثر شام کے بعد دبے پاؤں کوئی دل کے مندر میں گھنٹیاں بجا جاتا، روح کے طاقچے میں رکھا چراغ ٹمٹمایا رہتا۔ رومنی نے اپنا وعدہ نبھایا، باقاعدگی سے چراغ میں آنسو ڈالتی رہی، میں اس ذائقے کو بھولنا چاہتا تھا لیکن پہلا لمس، پہلا ذائقہ کہاں بھولتا ہے۔ مجھے تو بچپن کے اس اناس کی قاش کا ذائقہ بھی نہیں بھولا جو ہمارے ایک ملنے والے مشرقی پاکستان سے لائے تھے۔ مغربی پاکستان کا تو مجھے نہیں معلوم لیکن ہمارے گاؤں میں اناس پہلی بار آیا تھا اور چوپال میں کئی لوگ اناس دیکھنے آئے تھے۔ مجھے اس اناس کی شکل آج تک نہیں بھولی۔ میرے حصے میں صرف ایک قاش آئی تھی۔ اس کا ذائقہ برسوں گزرنے کے باوجود آج بھی اپنی تازگی لئے مجھے یاد ہے۔ آنے والے برسوں میں ٹین کے ڈبوں میں بند باسی اناس کئی بار کھائے لیکن اس پہلی تازہ قاش کا ذائقہ نہیں بھولا۔

اناس کی شکل اور ذائقے کی طرح میں رومنی اور اس کے بوسے کو نہ بھول سکا۔ صرف ذائقے رہ گئے، رومنی مجھ سے کھو گئی۔ زندگی میں دوبارہ اس سے ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مندر میں یادیں مستقل ڈیرا جما چکی تھیں۔ شام کے بعد پاؤں قبر سے نکل کر مندر میں گھومنے لگتے۔ میں نے مسائل کے بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھاڑ پھینکے لیکن رومنی کی یاد کے ننھے سے پودے کو نہ اکھاڑ سکا۔

مجھے کئی ماہ سے مسلسل کھانسی رہنے لگی تھی۔ اس روز ہسپتال کی طویل راہ داریوں میں اپنے ایکسرے، بلڈ رپورٹ اور یورین ٹیسٹ کے سلسلے میں مجھے سرجن سے ملنا تھا۔ چھپاکا سا ہوا اور

مندر میں ہلچل مچ گئی۔ پرندوں اور روحوں نے وہ شور مچایا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تیز ہوائیں مندر میں بین کرنے لگیں۔

وہ ایک جھلک اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ یقین نہیں آرہا تھا وہ رومنی ہے، نہیں۔۔۔ کوئی اور ہے۔۔۔۔؟ رومنی۔۔۔شاید۔۔۔نہیں۔۔۔ہاں رومنی ہے۔ میری آنکھ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ لیکن ہونٹوں پر پینٹ اس بوسہ پر یقین تھا کہ وہ رومنی ہے۔ ہاتھ سلگنے اور ہونٹ پگھلنے لگے۔ رومنی اپنی ماں اور بہن کے ساتھ سرجیکل وارڈ کی طرف جا رہی تھی۔ علاقے کے ڈاکٹر کی شہرت کی وجہ سے لوگ دور دراز سے علاج کے لئے آتے۔ کلینک کے سامنے کاروں کا میلہ سا لگ جاتا، ایک جھلک اور ہو جاتی، بلڈ اور یورین ٹیسٹ کے بعد مجھے سرجیکل وارڈ میں جانے کو کہا گیا۔ گیلری میں بچھی کرسیوں پر میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ گھنٹی بجنے پر اگلے مریض کو بلایا گیا۔ میرے سینے میں سانس تیز ہو گیا۔ لیڈیز ویٹنگ روم سے رومنی اپنی ماں کے ساتھ نکل کر ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی، دروازہ بند ہو گیا۔

گھنٹی بجنے پر رومنی ڈاکٹر کے کمرے سے نکلی تو اس کے چہرے پر کوئی تحریر نہیں تھی۔ میں اپنی باری پر اندر گیا۔ سرجن، فزیشن کے ساتھ رومنی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے، مریضہ بچ جائے گی؟ پیپر ویٹ سے کھیلتے ہوئے فزیشن نے پوچھا۔"

"مشکل ہے۔۔۔ دماغ میں رسولی اور دوسرا ٹی بی کی وجہ سے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا وہ Survive کر سکے گی۔"

چیک اپ کرا کے میں باہر نکلا تو رومنی نہیں تھی۔ میڈیکل اسٹور کی بھیڑ میں بھی وہ نظر نہ آئی۔ میں کاروں کی طرف گیا۔ سلیٹی رنگ کی کار میں رومنی اپنی ماں کے کندھے پر سر ٹکائے چپ تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے جرات کی اور کہا، خالہ! میں احمد دین کا بھتیجا ہوں۔

خالہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ سب گھر والوں کا حال پوچھا۔ رومنی نے آنکھیں کھولیں، آنکھیں خاموش اور ویران تھیں۔ ان میں کوئی پہچان نہ تھی۔ بے رونق اور زرد آنکھیں۔ میں پریشان ہو رہا تھا کہ اتنے سالوں بعد اچانک ملنے پر رومنی کے چہرے پر کوئی خوشی کیوں نہیں ابھری۔

میں نے ہمت کی اور ہولے سے پکارا۔

رومنی۔۔۔۔

بیٹا، یہ پچھلے سال سے یادداشت کھو بیٹھی ہے۔دن بھر غسلخانے کی ٹونٹی چلا کر چھینٹے اڑاتی ہے یا گھر بھر میں اپنے پاؤں پر گیلی مٹی ڈال کر قبریں بناتی ہے۔

یہ سن کر میری جیب میں رکھے اکیلے بوسے سے خون رسنے لگا۔

زمین زاد

سائنس دان انسان کو مریخ پر اتارنے کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔

کانفرنس میں پورے کرۂ ارض کے سائنس دانوں اور مذہبی سکالرز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ کانفرنس کئی ماہ سے جاری تھی اور سائنس دانوں نے ہی حتمی فیصلہ کرنا تھا ترقی یافتہ ممالک نے پہلی بار ترقی پذیر ممالک کو نمائندگی موقع دیا تھا۔ کروڑوں میل کی دوری پر بسیط و عریض کائینات میں مریخ کا سفر سالوں پر محیط تھا۔ سائنس دان ایک طویل عرصے تک اس تحقیق میں سر کھپاتے رہے کہ ہم صرف مریخ سے لی گئی تصاویر کے مفروضے پر انسان کو مریخ پر اتارنے کا سوچ رہے ہیں اگر وہاں پر ہوا' پانی اور سورج کی روشنی نہ ہوئی تو اپالو کو اپنے مدار میں لوٹنے کے لئے چار سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے جب اپالو واپس اپنے مدار میں دوبارہ داخل ہو تو وہاں اتارے گئے انسان کہیں گپھاؤں میں گم ہو چکے ہوں۔ مریخ زمین سے کئی گنا بڑا ہے۔ ابھی تک ہم زمین کے دفینے پوری طرح نہیں کھوج سکے۔ آئے دن ماہرینِ آثارِ قدیمہ تحقیق کی دنیا میں کوئی نہ کوئی نیا شہر سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ اور پھر تخمینے اندازے پر اس کی عمر مقرر کرتے ہیں۔ چند سال پہلے NATIONAL GEOGRAPHIC SOCIETY نے گھنے گنجان جنگلوں میں سے پورا شہر برآمد کر ڈالا۔ اہرامِ مصر کے دفینے ابھی پوری طرح دریافت نہیں ہوئے۔ فراعینِ مصر کی حنوط شدہ لاشوں کے ساتھ مدفون خزینوں کی خبریں آئے دن دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالتی رہتی ہیں پاکستان میں موہن جوداڑو اور ہڑپہ کی دریافتوں کو آخری دریافت نہیں کہا جا سکتا۔ تو پھر مریخ پر اتارے گئے انسان کو کون تلاش کرے گا۔۔۔۔؟ سائنس دانوں کو یہ خدشہ بھی تھا کہ مریخ پر وقت کا پیمانہ یکسر مختلف ہوا تو کیا ہوگا۔۔۔۔؟ ممکن ہے زمین سے بھیجا جانے والا انسان وہاں پانچ سو سال یا اس سے بھی زیادہ زندہ رہے۔ تو انسانی زندگی کے ارتقا کے لئے ایسا آکسیجن سلنڈر تیار کیا جانا چاہیے جو اس کی بقا اور سانسوں کے تسلسل کے لئے کم از کم ایک ہزار سال کافی ہو۔ ماہرین کی رائے یہ بھی تھی کہ قدیم ادوار میں انسان کی عمر ہزار سال بھی رہی ہے اس لئے حفظِ ما تقدم کے طور پر آکسیجن سلنڈر کی CAPACITY کم از کم پانچ ہزار سال ہونی چاہئے۔ تاکہ مریخ اور زمین کے درمیان ہزاروں سال تک رابطہ رہ سکے۔ اپالو میں ایک ایسا جدید سسٹم بھی فٹ کیا جا رہا تھا تاکہ زمین اور مریخ کے درمیان انسانی رابطہ منقطع نہ ہونے پائے۔ پورے کرۂ ارض کے مذہبی سکالرز اور سائنس دانوں کو مدعو کیا گیا تھا تاکہ اپالو اجتماعی رضامندی سے بھیجا جائے اور اس پر کوئی ایک ملک اپنا حق نہ جتا سکے۔۔ مذہبی سکالرز کا کہنا تھا کہ مریخ پر بھیجے جانے والے

انسانوں کوتمام مذہبی کتابیں ساتھ دی جائیں۔قرآن انجیل بارناباس کا جدید ترین نسخہ جوترکی کے پہاڑوں کی ایک غار میں سے دریافت ہوا، گرنتھ ہندومت کی تعلیمات کے مخطوطے۔۔۔لیکن سائنس دانوں نے اس فیصلے کے خلاف ووٹ ڈالا۔ان کا موقف یہ تھا کہ ہم مریخ پر صرف ایک جوڑا اتار رہے ہیں۔ MALE اور FEMALE ۔جن کے درمیان میاں اور بیوی کا رشتہ ہے۔نسلِ انسانی کی بقا کے لئے ساتھ ہزاروں آکسیجن سلنڈر بھیجنے کی بھی تجویز تھی۔تاکہ وہاں نو مولود بچے کسی مشکل کا شکار نہ ہوں۔خوراک کا بہت اعلیٰ انظام ترتیب دیا گیا تھا۔خوراک کا ایک کیپسول ایک سال تک کھانے پینے سے بے نیاز کرنے کو کافی تھا۔اور کیپسولز کی تعداد ملین میں تھی۔

بھیجے جانے والے انسانی جوڑے کا DNA کے ذریعے مکمل طبی معائنہ کیا گیا۔طبعی عمر میں انہیں کسی بیماری کا سامنہ نہیں تھا۔اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ بھیجے جانے والے جوڑے کوتمام مذاہب اور سائنسی علوم پر مہارت ہو۔

کانفرنس جاری تھی۔

مندوبین اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔

موضوعِ بحث یہ بات تھی کہ ساری باتیں اور فیصلے درست لیکن مریخ پر بھیجے جانے والے انسان کو مذہب سے دور ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔سائنس دانوں کا کہنا تھا کہ زمین پر فساد کی جڑ مذہب ہی ہے۔خوفناک جنگیں ہتھیاروں کی دوڑ تیر سے میزائل تک منجنیق سے توپ اور ٹینک تک اور آگ کے گولوں سے ایٹم تک تباہی کے جتنے بھی ہتھیار ہیں وہ مذہبی منافرت کی بنیاد پر ہی ایجاد ہوئے ہیں۔امن قائم کرنے کی آڑ میں اپنے مفادات کی جنگیں لڑی جاتی ہیں۔مذہبی سکالرز نے پرزور اور مدلل طریقے سے سائنس دانوں کی اس رائے کورد کرتے ہوئے کہا کہ انسانیت کو رہنمائی صرف مذہب نے عطا کی ہے۔ان کا کہنا تھا اس حیوانِ ناطق کوانبیاء ورسل نے انسانیت کا درس نہ دیا ہوتا تو اس کے سفلی جذبات اسے حیوانوں سے بدتر بنا دیتے۔اور آج بھی جن انسانوں کا باطن تیرہ وتاریک ہے وہ پوری انسانیت کو جنگ کی ہولناک تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں ۔اس لئے مریخ پر اترنے والا انسان اگر مذہب سے بیگانہ رہا تو اس کے لئے وہاں زندگی عذاب ہو جائے گی۔اس کے جذبات احساسات اور ذہن میں پنپنے والے سوالوں کو رہنمائی کہاں سے

ملے گی۔۔۔؟ اسے مذہبی کتابوں سمیت بھیجا جائے۔ ان کتابوں میں سے وہ کس کتاب سے زیادہ رہنمائی حاصل کرتا ہے یہ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا جائے۔ لیکن سائنس دانوں کی سوئی اس ایک نقطے پر اٹکی ہوئی تھی کہ انسان کو مذہب سے دور ہی رکھا جائے۔

ساری تیاریاں مکمل تھیں بس یہی آخری فیصلہ ہونا باقی تھا۔ خوراک کے کیپسول کا آخری بار پھر تجزیہ کیا گیا۔ آکسیجن سلنڈرز اور دیگر مشینی سامان کا آخری **Computrized** چیک اپ کیا گیا۔۔۔۔ آخری روز مذہبی سکالرز واک آؤٹ کر گئے۔ ان کا موقف تھا کہ ہماری بات کو بے وزن ہی رکھنا تھا تو ہمیں مدعو کس لئے کیا گیا تھا۔ سائنس دان پھر سر جوڑ کر بیٹھے اور فیصلہ کیا کہ اتنے عظیم الشان منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مذہبی سکالرز کی بات مان لی جائے اور مختلف مذاہب کی **CDs** اور **Hard Disks** کو ساتھ جانے دیا جائے۔

جس روز اپالو نے زمین کے مدار سے نکل کر کائینات کی وسعتوں کو کھوجنا تھا۔ اس روز پورے کرۂ ارض کے انسان ٹیلیویژن اور انٹرنیٹ پر بیٹھے کاروائی دیکھ رہے تھے اپالو خلا کی پہنائیوں کو چیرتا اپنی منزل کو دوڑ رہا تھا۔ اور اربوں انسانوں نے یہ انتظار کھینچا تھا کہ مریخ پر زندگی کے آثار ہیں بھی کہ نہیں۔۔۔؟ زمین پر زندگی اپنے معمول پر رواں ہوگئی۔ کس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اپالو کی واپسی کا انتظار کھینچتا۔ البتہ سائنس دان اپنی دنیا اور اپنے کام میں انتہائی مگن تھے۔ دو سال بعد جب اپالو مریخ کے مدار میں داخل ہوا تو دونوں میں بیوی کے دل زور سے دھڑکے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہے تھے جہاں ان کا کوئی اپنا نہیں تھا وہ بالکل تنہا تھے انہیں یہ بھی تو معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے جیسے انسانوں میں زندہ لوٹ بھی سکیں گے یا نہیں۔۔۔؟ وہ نئی دنیا اور وقت کے نئے پیمانوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ انہیں تنہائی کے جان لیوا عذاب کا بھی سامنا تھا اور نئی دریافتوں کی دھن بھی تھی ان کا سائنس روم اپالو سے کٹ کر الگ ہوا تو انہوں نے اپالو کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ آخری زمینی رابطہ۔۔۔ اپالو۔۔۔ وہ بھی گیا۔!

سائنس روم کہاں جا اترا۔۔۔؟ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہر طرف گھور اندھیرا تھا۔ انہوں نے زمین پر پیغام بھیجا کہ مریخ پر گھپ اندھیرا ہے۔ جانے اس کرے کا کوئی سورج ہے بھی کہ نہیں۔ جب تلک روشنی نہ ہو کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہم اپنے کمرے میں بند ہیں اور روشنی کا انتظار کر رہے

ہیں۔

لیکن سرچ لائیٹ کے ذریعے یہ تو بتائیے کہ جگہ کیسی ہے۔۔۔؟ صحرا ہے یا پہاڑی سلسلے ہیں۔۔۔؟

ہم اس وقت ایک لق ودق صحرا میں ہیں

کئی ماہ گزر گئے دونوں میاں بیوی او بھ گئے۔ وہ انسانی چہروں اور زمین کے نظاروں کے لئے بے تاب ہونے لگے لیکن کچھ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ آواز' چہکار اور نہ ہی کوئی منزل۔۔۔! ان کے ہاں پہلے بچے کی ولادت پر ان کی زندگی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بچے کی شکل میں وہ تنہائی کا عذاب بھول گئے۔

CDs اور انٹرنیٹ پر وہ پہروں مختلف النوع موضوعات کی WEB SITES کھول کر اپنی تنہائی کم کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کا کوئی غمگسار اور دمساز تو تھا نہیں کبھی کبھی لایعنی اور بے معنی گفتگو کرتے ہوئے وہ بے ساختہ ہنس پڑتے۔ اور کبھی اداسی ان کو گھیر لیتی۔

ایک دن اس کی بیوی نے کمپیوٹر سکرین سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ ایک بات کہوں۔۔۔۔؟

کہو۔۔۔۔!

جس روز ہم مریخ کی سیر کو نکلیں گے نا۔۔۔! تو میں پتھروں پر ایک تحریر کندہ کروں گی کہ ہم انسان ہیں۔

کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟

میں یہ تحریر رقم کروں گی کہ ہم انسان ہیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ ہم کرۂ ارض سے آئے ہیں تا کہ ہماری Next Generation خود کو بندر اور چمپیزی کی اولاد نہ سمجھتی رہے۔

تم سائنس دان ہو کر ذہن میں ایسی سوچ کو جنم دے رہی ہو۔ جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔

دلیل ہے۔۔۔۔۔۔۔!

کیا۔۔۔؟

وہ بے ساختہ ہنسی۔۔۔ میرے والدین انسان تھے۔ میرے والدین کے والدین بھی

انسان تھے۔ مذہبی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچتی ہے۔ کہ ہم کئی ہزار سال سے انسان ہی ہیں۔ تو پھر اس بات کو مان لینے میں کون سی بات مانع ہے۔ جیسے ہم زمین سے مریخ پر آاترے ہیں اسی طرح ہمارے FORE FATHERS کسی اور جہان سے زمین پر آاترے ہوں گے۔ جیسے ہم سے یہ نسلِ انسانی چل نکلی ہے ویسے ہی ان کی نسل کا ارتقاء شروع ہو گیا ہوگا۔۔۔ وہ اپنے بچے کو دیکھ کر مسکرائی۔

تم Religeous ہوتی جا رہی ہو۔ سائنس دانوں کی سوچ درست تھی کہ مذہبی کتابیں ساتھ نہیں ہونی چاہئیں

تم جو بھی کہو۔۔۔ میں تو آنے والی نسلوں کے نام یہ پیغام چھوڑ جاؤں گی کہ تم انسان کی اولاد ہو۔ واقعی انسان اس کائنات کی بہترین Creation ہے۔ بے کیف زندگی۔۔۔ مکمل مشینی۔۔۔ ان کو وقت کا پیمانہ بھی معلوم نہیں تھا۔۔۔ سونے جاگنے کے اوقات بے ترتیب تھے۔

ایک دن ان کی پریشانی اس وقت سوا نیزے پر پہنچ گئی جب اچانک ان کا رابطہ زمین سے منقطع ہو گیا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔۔۔ وہ کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی اپنے معصوم بچے کو دیکھتے۔ وہ پہروں سر کھپاتے رہے۔ Internet کو متعدد بار Reconnect کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود۔۔۔ خوف سے خون ان کی رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ زمین سے رابطہ بحال نہ ہوا تو ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔۔۔؟ اگر موت نے آلیا تو اس بچے کا کیا ہوگا۔۔۔؟ کیا یہ سسک کر جان دے دے گا۔۔۔۔؟ ان کی سوچیں الجھ گئیں۔ ان کے پاس تو فرار کا رستہ بھی نہیں تھا۔ مریخ بارونق کرہ تو تھا نہیں۔۔۔ جنگل ہوتے، پہاڑ ندی نالے، جھرنے تو زندگی جینے کا سامان کر لیتے' انہیں یقین ہو گیا کہ کوئی ایک ہستی ہے۔ جس نے کرۂ ارض پر بلا تفریق' رنگ و نسل و مذہب انسانوں سے لے کر چرند' پرند' حیوان' حشرات الارض بلکہ ہر ذی روح کی زندگی جینے کا پورا پورا سامان کیا۔ زمین سب کے لئے۔۔' سورج' چاند' ستارے' پانی' ہوا۔۔۔ اور بارشوں پر سب کا برابر حق۔۔۔۔۔ سب بلا معاوضہ مستفیض ہوتے ہیں

وہ واقعی رب العالمین ہے۔۔۔ عورت کے منہ سے بے ساختہ نکلا

کون۔۔۔۔؟

اللہ۔۔۔ وہی اللہ۔۔۔ جس نے صرف کرۂ ارض انسانوں اور جانداروں کے رہنے کے

لئے بنایا۔ ہم بے کار کے سفر پر نکلے ہیں۔ کسی بھی کرّے پر ہمیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔۔۔!

یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم جانے کیا اوٹ پٹانگ سوچ رہی ہو۔

میں یہی سوچ رہی ہوں کہ ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے ابھی ہمارا ایک بچہ ہے۔۔۔۔ اگر بہت سے بچے ہوں تو رونق بڑھ جائے گی۔ یہاں کون سا آبادی کے گنجان ہونے کا خطرہ ہے؟ یا خوراک کے مسائل ہیں لیکن جب وہ جوان ہوں گے تو ان کا مستقبل کیا ہوگا۔۔۔؟ تعلیم۔۔۔ شادی۔۔۔؟ شادی تو نہیں ہوسکتی۔ وہ سب بہن بھائی ہوں گے۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

ابھی وقت تو آئے۔ بچے جوان ہوں گے تو مذہبی کتابوں سے رہنمائی لے لیں گے۔

ابھی تو ہم نے مریخ کی سیر کرنی ہے۔ اس کمرے سے نکلنا ہے۔ بچے جوان ہوں۔ وہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ہمارے باہر نکلنے کے سسٹم کو کنٹرول کریں پھر کہیں جا کر مریخ کے اسرار کھلیں گے۔۔۔۔! اس کے خاوند نے اسے تسلی دی۔

وہی کرۂ ارض اچھا تھا۔۔۔ ہوا' پانی' بادل' انسان' جانور' محبتیں نفرتیں' جھگڑے' خوشیاں' رونقیں میلے بہاریں۔۔۔۔ یہ جو اس بسیط وعریض کائنات میں اربوں کہکشائیں بکھری ہیں ہم ان کو اپنی مختصر عمر ساٹھ ستر سال کے پیمانے میں نہیں کھوج سکتے۔۔۔۔ ناممکن۔۔۔۔ ہمیں بس زمین پر ہی رہنا چاہیے۔

ان کے ہاں کئی بچوں کی ولادت ہوئی۔ وہ سنِ شعور کو پہنچے۔ ان کی کل کائنات بس یہی کمرہ تھا۔ اب ان سے اہم کام لینا باقی تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوئے' پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔

والدین نے جب ان کو یہ بتایا کہ ہم ایک ایسے کرّے سے آئے ہیں جہاں آکسیجن سلنڈروں کی بجائے فضا میں موجود ہوتی ہے۔ وہاں پہاڑ ہیں۔۔۔ پانی' سبزہ' جنگل' چرند پرند اور ہمارے جیسے اربوں انسان' مختلف الوان' نسلیں' بلند وبالا عمارات' کاریں، ٹرینیں اور ہوائی جہاز' انواع واقسام کے کھانے' اور جدا جدا ذائقہ رکھنے والے سینکڑوں پھل' میوہ جات'۔۔۔ بس کیا پوچھتے ہو۔۔۔ زمین رنگ ونور سے بھری ہوئی ہے۔

تحیر زدہ بچے ایک دوسرے سے پوچھتے۔۔۔ یہ کس جہان کی باتیں اور قصے ہیں۔۔۔؟

کیا وہاں انسان ایک کمرے میں نہیں رہتے۔۔۔۔؟ ان کی آنکھوں میں سوال تیرتے

نہیں ۔۔۔۔۔!وہ جہاں جانا چاہیں جا سکتے ہیں پیدل' گاڑیوں پر' ہوائی جہازوں اور سمندری جہازوں کے ذریعے۔اور وہ مزے دار ذائقوں والے کھانے کھاتے ہیں۔سبزیاں' گوشت' دالیں' کیک' پیسٹریاں' بسکٹ اور ساتھ رنگا رنگ مشروبات بھی۔۔۔۔۔!

اچھا!!!!!۔۔۔۔۔ بچے حیران ہو کر پوچھتے۔۔۔تو کیا وہ وہاں سال میں اپنی خوراک کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ایک کیپسول نہیں لیتے۔

جب انہوں نے National Geographic کی CDs کی مدد سے دنیا کے مختلف ممالک کی ڈاکومنٹریز دیکھیں۔حیرت انگیز مناظر' انسان اور ان کی طرزِ رہائش' رسم و رواج' رنگا رنگ کھیل اور تفریحی سلسلے تو تحیر سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔انہیں یقین ہو گیا کہ ہمارے والدین جنت سے نکل کر آئے ہیں۔لیکن آخر کیوں۔۔۔۔۔؟

وہ جنت سے کیوں نکلے یا نکالے گئے۔۔۔؟ ان کا قصور کیا تھا۔۔؟ ہم بھی وہیں پر پیدا ہوتے' وہیں رہتے تو کتنا مزہ رہتا۔۔۔۔۔! جانے ہم وہاں کبھی جا بھی سکیں گے یا نہیں۔

مما۔۔۔ یہ جگہ رہنے کے لئے نہیں ہے۔ہم جنت میں واپس کب پہنچیں گے۔۔۔۔؟

دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔۔۔

اب مذاہب کو مان لینے میں حرج ہی کیا ہے۔Specially اسلام کو۔۔۔۔ میں نے قرآن کا Deeply مطالعہ کیا ہے۔اب تو مریخ پر ہونے کی وجہ سے ہم عین الیقین کی سرحد پر کھڑے ہیں۔یہ مریخ ہے۔اور جہاں سے ہم آئے ہیں وہ ارضی جنت۔بچوں کے لئے یہ دریا' ندی نالے' سرسبز وادیاں' بلندو بالا عمارات' انواع و اقسام کے کھانے اور مشروبات' ہم جنس'۔۔۔ ہم Docomentries کے ذریعے انہیں ان ذائقوں سے آشنا تو نہیں کر سکتے۔جس طرح زمینی جنت ایک زندہ حقیقت ہے بالکل ایسے ہی مرنے کے بعد ایک اور عالم ہے اور وہ بہت خوبصورت ہے۔۔۔۔۔اس کی بیوی نے خاوند کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

ٹھیک کہہ رہی ہو۔میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔چند روز پہلے میں نے اپنے بچوں کی زبانی بھی سنا۔وہ آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔وہ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔کیا یہ ممکن ہے کہ زمین پر وہ سب کچھ موجود ہو جس کی خبر ہمارے والدین ہمیں دے رہے ہیں۔سمندر' دریا' رنگ برنگے پرندے اور ان کی چہکار' انواع و اقسام کے کھانے اور مشروبات' ہمارے جیسے اربوں

انسان اور پھر آکسیجن سلنڈر کے بغیر زندہ رہنا۔۔۔۔؟

ہمارے والدین جھوٹ تو نہیں بولتے نا۔۔۔۔! وہ زمین سے آئے ہیں۔ والدین کی بات جھٹلانی نہیں چاہیے۔

میرا تو یقین ہے کہ زمین ہے اور ایک دن ہم وہاں پہنچ جائیں گیا ور مزے لوٹیں گے۔

جب بچوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی، سائنسی علوم کے ماہر ہو گئے تو میاں بیوی نے اپنے مخصوص لباس اور سسٹم کے ذریعے سائنس روم سے نکل کر مریخ کی سیر کا پروگرام بنایا۔ Control System پر بٹھا کر انہیں ہر بات اور آپریشن سسٹم سمجھا دیا گیا۔ تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔

پہلے روز وہ اپنے مخصوص خلائی لباس میں تھوڑی دور تک گئے اور لوٹ آئے۔ اپنا تحقیقی سفر جاری رکھتے ہوئے انہوں نے پورا مریخ گھوم کر دیکھ لیا۔ بنجر پہاڑوں اور صحراؤں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہیں عمیق اور خوفناک غار بھی دیکھنے کو ملے۔ ان میں اترنا موت کو دعوت دینا تھا۔ جن تصویروں کو دیکھ کر سائنس دان اندازے اور تخمینے لگا رہے تھے کہ یہاں پانی ہے وہ یہی عمیق اور اندھے غار تھے۔ سائنسی ترقی میں وہ اتنے آگے نکل گئے کہ انہوں نے دوسری کہکشاؤں کو سر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں رفتار کے پیمانے بدل گئے تھے۔ وہ جس سیارے پر بھی جا اترے وہ لق ودق صحراوئں اور خشک بنجر پہاڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ حیران تھے کہ ان اربوں ستاروں اور کہکشاؤں کو کس نے تھام رکھا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے ٹکراتے کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟ اسی بات پر ایک روز بحث جاری تھی۔

مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن میں اس بات کا جواب موجود ہے۔۔۔۔۔۔ عورت نے تیقن سے کہا۔

کیا لکھا ہے اس کتاب میں۔۔۔۔؟

اس نے کمپیوٹر میں قرآن کی CD ڈالی۔ اسے Open کیا۔ بائیں جانب ایک سو چودہ سورتوں کی فہرست تھی۔ اس نے Al -Yaseen پر کلک کیا پھر آیت تلاش کی۔۔۔

یہ دیکھو۔۔۔۔۔۔۔!

''اور ایک نشانی ان کے لئے رات ہے۔ کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔ اور اس وقت ان

پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے۔یہ خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں''

Amaizing ۔۔۔واقعی حیران کن کتاب ہے۔اس کا خاوند تحیر میں ڈوبا قرآنی آیت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ابھی ٹھہرو۔۔۔۔۔۔اگلی آیت دیکھو۔

''اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لئے ویسی ہی اور چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں''

اوہ۔۔۔میرے خدا۔۔۔۔اللہ کہتا ہے کہ ہم نے ویسی اور چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سائینسی ترقی کار سے جہاز اور اپالو تک جو ہماری سواریاں ہیں ان کا اصل خالق اللہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حیرت انگیز کتاب ہے یہ۔۔۔۔۔!

اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اربوں کہکشاؤں میں مغز ماری فضول ہے۔ہوا پانی اور دوسری مخلوق کا کہیں وجود نہیں ہوگا۔ہمیں زمین پر ہی رہنا چاہئے اور اسی کو سنوارنا چاہئے۔

بالکل۔۔۔بلکہ میں تو مذہبی کتابوں اور حدیث کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جس طرح ایٹم ایک ذرہ ہے اور پوری دنیا کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے ایسے ہی قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو پوری دنیا کو سنوار سکتی ہے۔میں نے اس کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔یہ زمین پر انسان کو اس کی زندگی کے ایک ایک لمحے کی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔اس کی رہنمائی میں زندگی گزاری جائے تو انسان دونوں جہانوں میں ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتا ہے۔

اگر کبھی زمین سے رابطہ ہو گیا اور ہم واپس اپنی دنیا میں پہنچ گئے تو تمہاری اس **Fundamental Theory** کو کون قبول کرے گا۔؟

بھلے سے کوئی نہ کرے۔۔۔۔میں سچ جان گئی ہوں۔۔۔۔آؤ میں تمہیں ایک اور چیز دکھاؤں۔اس نے سورت **Al-Bani Israeel** پر کلک کیا۔۔۔دیکھ رہے ہو۔۔نا۔!

''وہ ذات پاک ہے۔جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے (یعنی خانہ کعبہ) سے

مسجدِ اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا۔ تا کہ ہم اسے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر محمد ﷺ بغیر اپالو کے آسمانوں پر کیسے پہنچ گئے۔۔۔۔۔؟ وہ عہد تو ترقی یافتہ نہیں تھا۔۔۔ اس کے خاوند نے پوچھا۔

وہ عہد اس **Universe** کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ عہد تھا۔ محمد ﷺ کا واقعہ معراج ایک ایسی **Univocal** سچائی ہے جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔

دیکھو اپالو **Material** ہے۔۔۔۔ ہے نا۔۔۔! اس میں انرجی **Atomic feul** ہے۔ اسی انرجی سے یہ لاکھوں میل کی مسافت طے کرتا ہے۔ یہ فیول نہ ہو تو بے جان مادہ زمین پر ہی پڑا رہے۔۔۔۔ اسی طرح مسلمانوں کے پیغمبر محمد ﷺ کے باطن میں اللہ نے روحانی اٹامک فیول رکھ دیا تھا۔ انتہائی **Powerful Atomic Feul**۔

اگر **Atomic feul** سے یہ مادہ' یہ اپالو اڑ سکتا ہے۔ لاکھوں میل کی مسافت طے کر سکتا ہے تو روحانی **Feul** سے جسم جو ایک مادہ ہے کیوں نہیں اڑ سکتا۔۔۔۔ وہ یقیناً آسمانوں پر گئے تھے۔۔۔۔!

چلو تمہاری بات مان بھی لی جائے۔۔۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم **Friction** کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔۔۔۔ اس کے شوہر نے سوال کیا۔

اسے بھی سائینس ثابت کر چکی ہے۔۔۔۔

کیسے۔۔۔۔؟

آئن سٹائن کی تھیوری ہے کہ اگر مادہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرے تو وہ روشنی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

گفتگو میں ان کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ انہیں گرد و پیش کی خبر ہی نہیں تھی۔ بچوں کی چیخوں پر وہ ایک دم چونکے۔۔۔ بچوں کے چہرے خوشی سے گلنار ہو رہے تھے۔

زمین سے رابطہ بحال ہو گیا۔۔۔۔۔ خوشی سے سب کی آوازیں کانپ رہی تھیں۔

ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ آواز صاف اور واضح تھی۔

ہم زمین سے بول رہے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ لوگ آج سے پچاس ہزار سال پہلے

مریخ کے مدار میں داخل ہوئے تھے۔۔۔۔۔!

کیا کہا۔۔۔؟ پچاس ہزار سال۔۔۔۔! ہمیں تو بمشکل پچاس سال ہوئے ہوں گے۔

وہاں وقت کا پیمانہ اور ہو گا۔۔۔سائنس دانوں اور حکومتوں کے متفقہ فیصلے کے مطابق صدیوں سے اپالو باقاعدگی سے مریخ کے سفر پر روانہ کیا جا رہا ہے۔اسی آس پر کہ شاید کبھی انہونی ہو جائے اور آپ سے رابطہ ہو جائے۔اپالو مریخ کے مدار میں داخل ہونے والا ہے۔آپ کا سائنس روم خود بخود اس کے ساتھ منسلک ہو جائے گا۔

وہ جب زمین پر اترے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہزاروں نسلیں گزر چکی تھیں۔

وہ عظیم الشان استقبال کے باوجود بالکل اجنبی تھے۔

وہ کس سے گلے ملتے۔کون ان سے مل کے خوش ہوتا۔۔۔۔۔کون ان کی تنہائی کا دکھ بانٹتا۔ان گنت چہروں کے درمیان ان کا کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔۔۔!

وہ اربوں انسانوں کے درمیان پھر تنہا ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔۔!

اور یگان

مدقوق چہرہ لئے علی احمد میرے سامنے بیٹھا ہولے ہولے کھانس رہا تھا۔اس کی کہنیاں میز

پر ٹکی تھیں۔ چہرہ بنجر ہاتھوں میں دھرا تھا اور ہڈیوں کے پیالے میں دو خشک آنکھیں رکھی تھیں۔اس کے ہونٹوں پر پپڑیوں کی شکل میں چھوٹی چھوٹی قبریں اگ آئی تھیں۔ان میں اس کا ماضی مدفون تھا۔صعوبت اور عسرت کے جانگسل مراحل کا استعارہ میرے سامنے تھا۔مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پپڑیوں کے گورستان میں مدفون یادوں کا پتہ لگا تا۔ابھی وہ میرے سامنے ہڈیوں کے پیالے میں دو آنکھیں رکھے زندہ تھا۔

سالمیہ کے ساحلی ہوٹل میں ہم کھلے آسمان تلے بیٹھے سمندر میں جھلملاتی روشنیاں دیکھ رہے تھے۔بائیں ہاتھ کی میز پر تین لبنانی لڑکیاں ماحول میں اپنی ہنسی کے کنکر پھینک رہی تھیں۔ان کی کھنک سے خاموش فضا میں پل بھر کو پھلجڑیاں چھوٹتیں اور وہ پھر اپنے سامنے رکھے مشروبات sip کرنے لگتیں۔باوردی فلپائنی پستہ قد لڑکیاں میزوں پر انواع واقسام کے کھانے اور مشروبات چن رہی تھیں۔ان کی شرٹ کی داہنی جیب پر پہچان کے لئے ان کے ناموں کی چھوٹی چھوٹی تختیاں آویزاں تھیں۔اس طرح انہیں پکارنے میں آسانی رہتی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں موسیقی کے دھیمے سر تھے۔ماحول پُر کیف اور سرور آگیں تھا۔علی احمد ہر رنگ سے لاتعلق کہیں اور کھویا ہوا تھا۔اس کی بے نور آنکھوں میں کئی کہانیاں پنہاں تھیں۔ملائم مسکراہٹ کا میک اپ کئے فلپائنی لڑکی ہمارے سامنے کھانا چن گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کھانا کھاتا رہا اور دھیرے دھیرے اندھیرے میں گھلتا رہا۔

علی احمد!تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ آخری بار جب ہم کویت سٹی کی سوق الوطنیہ میں ملے تھے تو تم سرسبز وشاداب تھے۔۔۔بولو گے بھی یا۔۔۔؟

کیا بولوں۔۔۔؟ میرے چہرے پر تمہیں کوئی تحریر نظر نہیں آ رہی۔۔۔؟

چہرے سے کرب کا اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے۔۔۔تحریریں کہیں نیچے گہرے پانیوں میں رہتی ہیں۔۔۔اور ہر انسان تیراک نہیں ہوتا۔

ٹھیک کہتے ہو تم۔بس یار۔۔۔اجڑ گئے۔۔۔۔عتیقہ کو مراق اور دق نے گھیر لیا۔

کیسے۔۔۔؟

اس کیسے کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔دیکھ اس کی یادیں میرے ہونٹوں میں مدفون ہیں۔میں ہر وقت ہونٹوں کے مرقد پر دعا کے چراغ روشن رکھتا ہوں۔مجھے نہیں معلوم شعلہ سا کہاں سے اٹھتا

ہے۔چھوڑ، ان باتوں کو۔۔۔۔آ کھانا کھائیں۔میری کہانی بھی انہیں جیسی ہے جو ڈالر اور دینار کے لئے اپنی دھرتی چھوڑ آئے ہیں۔کوئی نئی بات نہیں۔۔۔

علی احمد، میں تمہیں کرید نہیں رہا۔ مجھے تمہاری کتھا نہیں سننی۔میں تمہاری کھنڈر آنکھیں اور ویران چہرہ دیکھ کر پریشان ہو رہا ہوں۔سڑک پار کرتے ہوئے مجھے تمہیں پہچاننے میں تھوڑی دیر لگی۔میں ایک دفعہ اسی سڑک سے گزر رہا تھا کہ مجھے شاہد مل گیا۔اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔وہ ایک نجی ادارے سے اپنی پانچ دن کی تنخواہ لینے آیا ہوا تھا۔وہ بے روزگار اور بھوکا تھا۔بھوک اور بے روزگاری نے اس کے خواب ریزہ ریزہ کر دیئے تھے۔اس نے کہا تھا، پانچ دن کی تنخواہ سے پیٹ بھر کے روٹی کھائے گا۔ اسی میز پر وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔سوزن serve کرتی رہی۔۔۔آج تم میرے سامنے ہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے، کل میں کسی کے سامنے بیٹھا اپنی بپتا ۔۔۔؟

نہیں، ایسے نہیں ہوگا۔میں بے روزگار ہوں، نہ کہیں میرے اندر بھوک ہے۔میرے اندر ایسے عذاب ہیں جنہیں میں نے خود کاشت کیا ہے۔میں جس دن اپنی دھرتی چھوڑ کر کویت پہنچا، میرے من میں صرف خواب تھے۔میری سوچ تھی کہ پیسہ کما کر خواب خریدے جا سکتے ہیں۔میرے اندر خوابوں کا میلہ لگا تھا۔ ان میں ایک خواب میں نے الگ سجا رکھا تھا۔ وہ تھا خوبصورت بیوی اور اپنے گھر کا خواب۔گریجوایٹ ہونے کے باوجود میں نے کویتی سنگاپوری کمپنی میں ایک واٹر ٹینکر ڈرائیور کی ڈیوٹی اس لئے سنبھالی کہ تنخواہ معقول تھی اور over time زیادہ تھا۔ ہر مہینے دینار گن کر جب انہیں پاکستانی کرنسی سے multiply کرتا تو میرے سارے خوابوں میں رنگ بھر جاتے۔وہ آسٹریلوی پرندوں کی طرح میرے من کی دنیا میں چہچہاتے۔ہر مہینے نئے پرندے میرے اندر بسیرا کرتے۔میں رقم پس انداز کر کے پاکستان گھر بنانے کی بجائے یہیں اپنا کاروبار settle کرنے کا سوچنے لگا۔جوں جوں دیناروں کے رنگین پرندے پنجرے میں زیادہ ہونے لگے، میں باہر کی دنیا کو بھولنے لگا۔دھرتی کی حسرت اور رشتہ داروں کے چہرے مدہم پڑتے گئے۔یہی زندگی تھی جو تم دیکھ رہے ہو۔ جسے دیکھنے کا خواب وہ ابھی تک دیکھ رہے ہیں۔ جنہوں نے اس چٹیل صحرا کو نہیں دیکھا۔میں نے ذہن سے اپنی دھرتی کو صاف کر دیا اور اس کی جگہ وہ خواب سجا لئے جو میرے نہیں تھے۔میں یہیں کا ہو رہا۔ماں کا اصرار تھا،

وطن لوٹ کر شادی کرلوں۔ میرا سرے سے لوٹنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ میں مکڑی کے جالے میں پھنس چکا تھا۔ ماں نے ایک لڑکی پسند کر کے مجھے خط لکھا۔لڑکی انگریزی لٹریچر میں ماسٹر ڈگری ہولڈر اور ایم۔فل تھی۔ ماں نے وہ تمام تعریفیں جو کسی بھی ضرورت رشتہ کے اشتہار میں ہوتی ہیں، مجھے لکھ بھیجیں۔ نکاح فون پر ہوا۔اور ایک دن سرخ گٹھڑی رات گیارہ بجے والی فلائٹ سے پہنچ گئی۔ میں نے چند خاندانوں کو مدعو کر رکھا تھا۔سمندر کنارے SAS Hotel میں تقریب ہوئی اور میں اسے اپنے فلیٹ میں لے آیا۔وہ میرے ان خوابوں سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی جو میں نے برسوں سے الگ کر رکھے تھے۔Wedding Night میں سب سے اہم بات جو میں نے کہی وہ یہ تھی کہ تم کبھی پاکستان نہیں جاؤ گی۔اس کی خاموشی کو حق مہر کی طرح میں نے رضامندی سمجھا۔دوسرے روز اسے پورے کویت کی سیر کرائی۔ جہراء سے لے کر مینا السعود تک اسے گھمایا۔وہ خوش تھی لیکن ایک بات میں محسوس کر رہا تھا کہ لمبی چوڑی کاریں، عظیم الشان مارکیٹوں میں چکا چوند روشنیاں دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔وہ خاموش تھی، میں یہی سمجھا، نئی آئی ہے آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گی۔زندگی نئی ڈگر پر چل نکلی۔ میں اسے ماہانہ اخراجات کے لئے ایک معقول رقم دیتا تا کہ وہ ہر وقت مجھ سے مانگنے کی کوفت سے بچی رہے۔اسے مطالعہ کا بے پناہ شوق تھا۔ایک دن اس نے مجھ سے پچاس دینار مانگے۔میرے ذہن کے calculator نے فوراً کرنسی multiply کی۔ چونک کر پوچھا، اتنی رقم۔۔۔؟ کہنے لگی، کتابیں لینی ہیں۔ میں نے رقم اسے دے دی۔اگلے روز وہ اردو، انگریزی کے ناول اور نفسیات پر چند کتابیں لے آئی۔سوچا گھر میں اکیلے پن سے اسے اکتاہٹ ہوتی ہوگی۔ چلو اس طرح دل لگا رہے گا۔

میں نے اتنی رقم پس انداز کرلی تھی کہ اپنا ذاتی کاروبار شروع کرسکوں۔انہی دنوں ایک مصری کے اشتراک سے میں بجلی کی دکان کھولنے کا ارادہ رکھتا تھا۔عتیقہ سے مشورہ کیا تو اس نے کہا، "کاروبار اچھی بات ہے، لیکن پہلے پاکستان میں اپنا گھر بنا لیا جائے"۔میں پاکستان لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔عتیقہ کی بات کو میں نے کارنر میں رکھ دیا اور دکان کھول لی۔گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔قیمتی پردے، کارپٹ، ڈیکوریشن نفیس اور عمدہ، ہر کمرے میں ایئر کنڈیشنر، مہنگی کراکری، دنیا جہان کی نعمتیں اور سہولتیں موجود تھیں۔عتیقہ کی موجودگی سے گھر میں ایک خوش کن

مہک اور خوشبو تھی۔ وہ کھانے کمال کے بناتی تھی۔ سلیقہ اس پر بس تھا۔ لیکن اس کی کم گوئی مجھے کھلتی تھی۔

پہلے بیٹے کی پیدائش پر اس نے مجھ سے پاکستان جانے کی اجازت مانگی۔ میں نے درشتگی سے کہا، یہ طے ہے کہ تم پاکستان کبھی نہیں جاؤ گی۔ اس نے چپ سادھ لی۔ میں اپنی دنیا میں کھویا رہا، پیسہ کمانے کی لت مجھے ہیروئن کے طرح لگ گئی۔ میرے معمولات میں رات دیر سے گھر آنا بھی شامل تھا۔ شروع شروع میں وہ پوچھ لیا کرتی تھی، پھر اس نے پوچھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ زیادہ وقت کتابوں کے ساتھ گزارتی۔ ایک روز میں رات گئے لوٹا تو وہ مطالعہ کر رہی تھی۔ میں سونے کے لئے لیٹنے لگا تو اس نے کہا، مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں تھکن سے چور تھا۔ اسے صبح تک ٹالنا چاہا، لیکن وہ چائے بنا لائی۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ اس کا اصرار تھا کہ میں جاگتا رہوں۔۔۔ کہنے لگی۔

علی احمد۔۔۔ آپ مجھے اس رنگین پنجرے میں قید کرنے کے لئے پاکستان سے لائے تھے۔ شرائط میں تو کہیں بھی یہ نہیں لکھا تھا کہ عمر بھر مقید رہنا ہوگا۔ میں Realize کرتی ہوں کہ خاوند کا گھر عورت کی آخری پناہ گاہ ہے لیکن یہ زمین ہماری نہیں ہے۔۔۔ یہ بنجر ہے، ہم یہاں کاشت نہیں ہو سکتے۔ ضروری نہیں کہ پیوند کاری بارآور ہو۔ تم نے کبھی میری بنجر اور اجاڑ روح کے دالانوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔۔۔ نہیں کی۔۔۔! مجھے ماں یاد آتی ہے۔۔۔ بہن بھائی۔۔۔ ابو۔۔۔ تمہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ میں روز بینارِ پاکستان جاتی ہوں۔۔۔ شالامار باغ اور مقبرہ جہانگیر کی سیر کرتی ہوں، راوی کے پل سے گزرتی بھینسیں مجھے کچل دیتی ہیں۔ میرا قیمہ ہو جاتا ہے۔ بوٹی بوٹی ہو جاتی ہوں۔ میں ساری رات کی کچلی صبح پھر سلامت ہوتی ہوں۔ میں عذابِ مسلسل میں گرفتار ہوں۔ تم مجھے آزاد نہیں کر سکتے؟

پہلی بار میں نے دیکھا کہ وہ رو بھی سکتی ہے۔ مجھے اس کا رونا اور بولنا اچھا لگا۔ لیکن میں نے اسے پاکستان جانے کی اجازت نہ دی۔ ایک دن کہنے لگی، "مجھے اس حکیم سے ملنا ہے جو ہندوستان سے آیا ہے۔"

اس ملک میں کوئی حکیم نہیں۔۔۔۔

منوج کی بیوی سیتا آئی تھی۔ وہ بتا رہی تھی کہ ایک کویتی علاج کے سلسلے میں ہندوستان گیا

تھا۔ وہ شفایاب ہو کر لوٹا تو اس نے حکومت سے اجازت لے کر حکیم کو مطب کھلوا دیا ہے۔

لیکن تمہیں اس سے کیا لینا۔۔۔؟

ایک جڑی بوٹی۔۔۔۔

جڑی بوٹی کا نام مجھے بتاؤ، میں لا دونگا۔

نہیں۔۔۔ تم نہیں لا سکو گے۔ تمہیں اتنی فرصت ہی کہاں ہے۔ ویسے بھی معمولی سی جڑی بوٹی ہے، مل ہی جائے گی۔۔۔ ماں روز گھر میں اس سے چٹنی بنایا کرتی تھی۔ ہمارے صحن میں ریحان کے کتنے ہی پودے تھے۔ میں ننھی ننھی پتیاں توڑ کے لاتی، انہیں دھو کر دوری میں ڈالتی، کوٹتی۔۔۔ تھوڑا انار دانہ، ایک مرچ اور پودینہ۔۔۔۔

میں قہقہہ مار کے ہنسا۔۔۔ یہ تہاری چٹنی میں ریحان ہی کیوں۔۔۔؟ پودینہ اور انار دانہ کیوں نہیں؟ علی احمد۔۔۔۔ تم نہیں سمجھو گے۔ تمہاری حسیات منجمد ہو گئی ہیں۔ میرے آنے سے تمہارے حصے کے خواب پورے ہو گئے لیکن میرے خواب۔۔۔؟

میں انہیں کہاں تلاش کروں۔۔۔؟ دو سال کی تو بات تھی۔ میں ڈاکٹریٹ کر لیتی۔ ماں نے دولت دیکھ کر مجھے جہنم میں دھکیل دیا۔

یہ جہنم ہے۔۔۔؟

تو اور کیا ہے۔۔۔۔؟ چھوٹی سی خواہش کی ہے کہ ریحان لا دو۔۔۔ تم طنز کر رہے ہو۔ تمہاری تنگ کھوپڑی میں مرجھایا ہوا دماغ یہ سوال بھی کرے گا کہ ڈاکٹریٹ اور چٹنی کا کیا Combination ہے۔۔۔؟ تمہیں پاکستان سے نفرت ہے اور یہ سرزمین تمہاری نہیں۔ تم فضا میں معلق ہو۔ علی احمد، میں نے گھر کا خواب ضرور دیکھا تھا، لیکن ایسے گھر کا نہیں جس میں روبوٹ رہتے ہوں۔۔۔ تم ایک مشین ہو، صرف مشین۔ میں پاکستان جاؤں گی۔۔۔ ضرور جاؤں گی، تم مجھے روکنا چاہو گے، لیکن نہیں روک سکو گے۔۔۔۔۔۔

میری کھوپڑی میں دماغ ابلنے لگا۔ پاکستان میں تمہارے پاس کیا تھا۔۔۔؟ دو کمروں پر مشتمل ڈربہ جس میں تم اپنے آٹھ بہن بھائیوں کے ساتھ کڑکتی رہتی تھیں۔۔۔ ایسا گھر۔۔۔ یہ سہولتیں، لمبی لمبی کاریں۔۔۔۔ تم شکر نہیں کرتیں۔

علی احمد۔۔۔۔ میں نعمتوں کو نہیں ٹھکرا رہی۔۔۔ مجھے تم سے گلہ ہے تم نے مجھے وقت دیا؟

توجہ دی؟ گھر میں سہولیات ہیں، لیکن تم تو نہیں ہو۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔تم لوٹ آؤ، تو شاید پاکستان نہ لوٹنے کا غم کچھ کم ہو جائے۔تم گھر نہیں رہتے، میرے دل میں نہیں رہتے، جانے کہاں رہتے ہو۔۔۔؟ مجھے کتاب کا سہارا نہ ہوتا تو جانے کب کی مر گئی ہوتی۔تم نے مجھ سے میرے وطن کی خوشبو چھین لی ہے۔ یہ بھی تمہارا احسان ہے کہ مجھ سے کتاب نہیں چھینی۔ اپنی دھرتی کے وہ سارے شہر مجھے یاد آتے ہیں جن کی خوشبو میرے من میں بسی ہے۔ میری صحت دن بدن گر رہی ہے۔ مراق کے دورے زیادہ ہو رہے ہیں۔ دق نے الگ دق کر رکھا ہے۔ مجھے علاج کی نہیں تمہاری ضرورت ہے۔تم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ میں نے ریحان کے پتے اور بیج صرف اس لئے کہے تھے کہ ان میں میری ماں اور وطن کی خوشبو ہے۔۔۔۔ سیتا بتا رہی تھی کہ اسے ہندی میں تلسی کہتے ہیں۔ تلسی آنگن میں محبت اور خوشبو کی علامت ہے۔ وہاں ہر آنگن اس سے مہکتا ہے۔ اس کی خوشبو سے بچے پروان چڑھتے ہیں۔۔۔ اس کا کوئی سا نام ہو۔۔۔ تلسی عورت ہے۔۔۔ اور عورت تلسی۔۔۔ یہ وفا کی علامت ہے۔۔۔

تمہارا ابھی تو یہ گھر ہے۔۔۔۔۔

نہیں، یہ میرا گھر نہیں ہے۔ میرا گھر وہیں تھا جہاں ماں کی مٹھاس اور بابا کی چھاؤں تھی۔ وہاں میرے آنگن میں تلسی کے کتنے ننھے ننھے سے پودے تھے۔۔۔ علی احمد، مجھے لگتا ہے میں بھی تلسی ہوں، تم نے مجھے پاکستان سے اکھاڑ کر اچھا نہیں کیا۔ مجھے یہ مٹی راس نہیں آئی۔ میں مرجھا گئی ہوں۔ مجھے میری جڑوں سمیت لوٹا دو، شاید میں جی اٹھوں۔

پاگل عورت۔۔۔ سو جا، بہت رات ہو گئی۔ صبح کام پر جانا ہے۔

نیند نہیں آ رہی۔

Sleeping Pills لے لو۔۔۔

نہیں۔۔۔ اس سے بہتر ہے میں مطالعہ کر کے سو جاؤں۔

انہی کتابوں نے تیرا دماغ خراب کیا ہے۔۔۔ تم ہوائی قلعوں میں رہنے لگی ہو، حقیقی زندگی تمہیں چھو کر نہیں گزری۔ بس کرو، اب چار بچے ہو گئے ہیں۔ انہیں سنبھالو، ان کا مستقبل سنوارو۔

عتیقہ کی ہنسی زہر آلود تھی۔ یہ چار بچے تمہارے ہیں نہ میرے۔۔۔ یہ میری دھرتی کے پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان ہیں۔ میں ان کی ذہنی پرورش کر دی ہے۔ یہ اپنی ماں کی گود میں

چلے جائیں گے۔ انہیں جانے سے نہ روکنا، یہ غلطی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ میں اپنے بچوں کا مستقبل کسی صورت تباہ نہیں ہونے دونگا، وہاں کیا رکھا ہے؟ میرا پارہ چڑھ رہا تھا۔

رات گزر گئی۔۔۔ دن گزر گئے۔۔۔۔ بیماری زور پکڑتی گئی۔ عتیقہ ہسپتال داخل تھی۔ مجھے منوج نے فون کیا کہ ہسپتال جلدی پہنچو۔ ایمبولینس دیکھ کر میں چکرا گیا۔ منوج نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ زمین گھوم رہی تھی۔ میرا بڑا بیٹا بوٹ کی ٹو سے زمین کرید رہا تھا۔

ابو، امی کی Dead Body پاکستان جائے گی۔

میرے حواس جواب دے گئے۔ مجھے تو اپنی دھرتی کا نام تک بھول گیا تھا۔ میں کسی کو بھی نہ روک سکا۔ عتیقہ نے کہا تھا، نا۔۔۔ میں پاکستان ضرور جاؤنگی، تم مجھے روکنا چاہو گے، لیکن نہیں روک سکو گے۔

اس کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں۔ گھر مجھے کاٹنے لگا۔ پورے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ لگتا تھا، کسی نے پورے وجود میں سوئیاں بھر دی ہیں۔

قہوے کے چھوٹے چھوٹے فنجان ہمارے سامنے رکھے تھے۔ ہڈیوں کے پیالے میں آنکھیں جانے کس کی تلاش میں بے چین تھیں۔۔۔ علی احمد نے مجھے کہا، رات میرے ساتھ گزارو، مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔۔۔۔

جب ہم ہوٹل سے نکلے، فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ گھر پہنچنے پر وہ سیدھا کچن میں گیا اور عربی قہوہ بنا لایا۔ دیوان خانے میں ایک شوکیس میں صرف کتابیں سجی تھیں۔۔۔ علی احمد نے کہا۔

آؤ، میں تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔۔۔ عتیقہ پاکستان چلی گئی، میں اسے نہ روک سکا۔ وہ خود تو چلی گئی، لیکن اپنی خوشبو اور کتابیں چھوڑ گئی۔۔۔ وہ کہا کرتی تھی، خوشبو، کتاب اور پرندوں کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ انہیں کہیں بھی جانا ہو، ویزے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کاش میں بھی خوشبو، کتاب یا پرندہ ہوتی اور اپنے دیس لوٹ جاتی۔

ایک دن مجھے اس کی کتابیں دیکھنے کا خیال آیا۔ ایک سرسراہٹ سی ہوئی، شاید میرے نام کوئی تحریر چھوڑ گئی ہو۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی، ورق الٹا۔۔۔ اس کے نام کے ساتھ ORIGAN لکھا تھا۔ مجھے اس لفظ کے معنی معلوم نہ تھے۔ میں نے دو تین اور کتابوں کے ورق

الٹے، اس کے نام کے ساتھ یہی لفظ لکھا تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے ساری کتابوں کے ورق الٹے۔۔۔ ہر کتاب میں ایک جیسی خوشبو تھی۔۔۔۔ اگلے روز میں حکیم کے پاس گیا۔۔۔۔

آؤ۔۔۔۔ برآمدے میں چلیں ۔۔۔علی احمد نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔۔۔ برآمدے میں بے شمار گملے رکھے تھے۔ ان میں ننھے ننھے پودے کھلے تھے۔ گملوں میں چھوٹی چھوٹی آویزاں تختیوں پر لکھا تھا

"ORIGAN"

دائمی حبس

مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میری سانسیں سینے کے پنجرے میں مقید ہو کر رہ گئی ہیں۔ سینے کے قفس کو قفل لگا ہے اور چابی کہیں کھو گئی ہے۔ سانس کا پنچھی پھڑ پھڑا تا رہتا ہے مرغِ بسمل کی طرح.... دروازہ بند ہے اور قیدِ تنہائی کا دورانیہ معلوم نہیں.... بستر کی قید.... گھر کی قید، بستی اور شہر کی قید.... ممالک کی قید سے لے صدیوں کی قید اور پھر یہ کائنات کا تنگ پنجرہ.... ایک پنجرے کی قید دوسرے پنجرے کی رہائی ہے یا ایک پنجرے کی رہائی دوسرے کی قید ہے.... سوالات کا ایک نا مختتم سلسلہ ہے....

ہم ارتقائی سفر میں پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھے.... کیا وہ بھی کوئی قفس تھا....؟ ہمیں قید اور رہائی کے درمیان کتنی صدیاں پاٹنی ہیں....؟ وقت کے کتنے پل عبور کرنے ہیں....؟ تباہی اور بربادی کے کتنے نظارے ہر آنے والی نئی آنکھ نے نظارہ کرنے ہیں....؟ صدیاں پلک جھپکنے میں گزر جاتی ہیں.... ان کی تاریخ مرتّب کی جاتی ہے، ہم صدیوں سانس لینے کے عمل سے گزرتے ہیں، ہماری مجبور و مقہور سانسوں کا حساب کہاں رکھا جا رہا ہے....؟

ہم قرن ہا قرن سے تولّد ہو رہے ہیں، مر رہے ہیں، سسک رہے ہیں، آہن گر ہماری سانسیں بھی ہمیں اپنی مرضی سے نہیں لینے دیتے۔ ہماری طرح عہد بھی پیدا ہوتے ہیں اور کہولت کو پہنچ کر مر جاتے ہیں.... آدم ثانی کی کشتی کوہِ ارارات کے کنارے آ لگی اور نسلِ انسانی کا سفر پھر سے جاری ہو گیا.... آسمان اور زمین کے پانی کے درمیان گذشتہ ساری تہذیبیں اور تمدّن، اور نسلِ انسانی گناہ کی پاداش میں نیست و نابود کر دیئے گئے.... عاد و ثمود گزر گئے، آسمانوں سے آگ برسی، بستیاں الٹ دی گئیں.... فرعون غرقاب ہوا اور قارون زمین میں دھنسا دیا گیا.... فراعینِ مصر اپنی عظمت و سطوت کے ساتھ ایک دن غروب ہو گئے۔ ہلاکو اور چنگیز خان کے عہد میں کتب خانے نذرِ آتش کر دیئے گئے، کھوپڑیوں کے مینار تعمیر ہوئے.... علم و عرفان کو دجلہ میں بہا دیا گیا.... فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہونے والا چاند گہنا گیا.... منوّر کرنیں ظلم کے بادلوں میں

گم ہونے لگیں.... عروج وزوال کی تاریخ طلوع وغروب کے عمل سے گزرتی رہی۔ سپین پر ہم نے صدیوں حکومت کی اور آج مسجدِ قرطبہ ہماری بے حسی پر نوحہ کناں ہے.... بابری مسجد تاریخ کا حصّہ ہوگئی اور مغلیہ سلطنت کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

میں سوچتا ہوں، کوہِ طور کی تختیوں سے لے کر عرب شاعر امراؤ قیس کی شاعری اور عہدِ حاضر کے ادب تک لفظوں نے کتنا سفر طے کیا.... کائنات میں موجود دھڑکتی، سانس لیتی تہذیبیں کیا ہوئیں.... انہیں کیسے موت آگئی؟ انہیں تباہی سے کس نے دوچار کیا۔ کائنات سفر میں ہے اور یہ کرّہ ارض لاکھوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے نہ صرف اپنے محور کے گرد گھوم رہا ہے بلکہ کہیں آگے اور آگے لامحدود جہان میں تیزی سے محوِ سفر ہے۔ اس سفر میں مجھے اپنی منزل کی تلاش ہے....

ایسی منزل جہاں پھول ہوں،

خوشبو اور تتلیاں ہوں،

جہاں ہونٹوں کی محرابوں میں محبت کے دیئے رکھے ہوں،

اور آنکھ کے طاقچوں میں انسانیت کی قندیلیں روشن ہوں....

بچے کی پہلی چیخ پھولوں سے زیادہ نرم اور سبک ہوتی ہے.... آنے والے عہد میں یہی بچہ جوان ہو کر پھول اگاتا ہے اور نفرت بھی کاشت کرتا ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے ہم موجود تھے اور مرنے کے بعد بھی موجود رہنا ہے۔ تو پھر ہم غیر فانی انسان آنے والی نسلوں کے لئے کیا کاشت کر رہے ہیں۔ ہم ازلی نہ سہی لیکن ہمیں فنا تو نہیں ہے۔ جب ہمیں فنا نہیں تو پھر کرۂ ارض کو فنا کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟

ہم زمین پر پھول کیوں نہیں اگاتے....؟ بارود کیوں کاشت کرتے ہیں....؟ تتلیوں کی بجائے جنگی جہاز کیوں تلاش کرتے ہیں....؟

تتلی سا نرم بچہ آہن گر کیوں ہو جاتا ہے....؟ یہی سوچ کر سانس کا پنچھی پھڑ پھڑاتا ہے....

اور مجھے شہروں، گھروں اور ملکوں کی قید سے خوف آنے لگتا ہے۔ میں کہیں نکلنا چاہتا ہوں، نئے اور ان دیکھے سفر پر جس کا کوئی انت نہ ہو۔ لیکن کہیں نہ کہیں انت ہوتا ہے.... کیوں ہوتا ہے....؟ اسی "کیوں" کی تلاش نے سینے کے پنجرے میں مقید روح کے پرندے کو بے چین کر رکھا

ہے....

کہیں لہو کی بوند گرتی ہے........!

میں اندر سے کانپ جاتا ہوں اور پہروں خائف پھرتا رہتا ہوں....

جس روز کسی ویگن، بس، ٹرین یا ہنستے بستے بازار میں دھماکہ ہو جائے، مہینوں سفر ملتوی کر کے گھر کی دیواروں میں پناہ گزین ہو جاتا ہوں۔ کشمیر اور بوسنیا کے گھر بار لٹتے دیکھتا ہوں تو اپنے گھر کی دیواریں مجھے لرزتی، کانپتی اور گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے، میرے گھر کی دیواریں ریت سے اٹھائی گئی ہیں۔ مسجد کے صحن میں بچھی نمازیوں کی لاشیں اور بند دروازے کے باہر گھومتا کلاشنکوف بردار محافظ مجھے جماعت کے ستائیس گنا ثواب سے محروم کر دیتا ہے.... میرے رب نے پوری زمین سجدہ گاہ نہ بنائی ہوتی تو جانے کیا ہوتا؟ سجدے کہاں ادا ہوتے پیشانیاں کہاں جھکائی جاتیں....؟

کہیں کوئی شہہ زور میزائل گراتا ہے تو رات کو صحن میں لیٹے لیٹے کئی بار نیند میں لرزتا ہوں.... آسمان سے ٹوٹنے والا تارہ میرے اندر خوف بو دیتا ہے کہ ابھی کوئی اندھا میزائل گرا۔

مہنگائی کی ہر نئی لہر میرے آنگن میں خوف کاشت کر جاتی ہے.... زرد رو چہروں والی یہ مخلوق.... میں بھی انہیں میں سے ہوں.... پیٹ پر پتھر باندھے سانس لیتا، صدیوں سے اپنی پیٹھ پر حکومتوں کے عذاب ڈھوتا، میں خمیدہ کمر، زمین زاد پس رہا ہوں۔ میں پہروں مہنگائی کے خوف پر زہر کی کونپلیں پھوٹتے دیکھتا رہتا ہوں، کیونکہ انہی کو آنے والی نسلِ نو کا رزق ہونا ہے.... میں شہروں سے خائف ہونے لگتا ہوں۔ شہر در شہر، بھوک، مہنگائی اور بے روزگاری کا عفریت گھومتا نظر آتا ہے۔

شہر کا خوف مجھے نیا اذنِ سفر عطا کرتا ہے اور میں دنیا کی سیر کا ارادہ باندھنے لگتا ہوں.... لیکن کیا کیجئے؟

بوسنیا، چیچنیا، کشمیر، فلسطین، افغانستان، کوسووو .... ہر جگہ آگ لگی ہے۔ ملکوں کی چار دیواری میں مجھے سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ پنچھی پھڑ پھڑاتا ہے، ہیروشیما اور ناگاساکی کی تپش مجھے رگِ جاں سے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے.... میری عمر صدیوں پر محیط ہے۔

میں ہر دور میں موجود رہا ہوں .... ہابیل قابیل کی لڑائی سے لے کر ہر عہد کی تہذیب

میرے اندر موجود ہے۔ میری عمر کا پیمانہ سالوں میں ماپنا عبث ہے۔ میری کہولت صدیوں کی امین ہے....

میں صدیوں کے پنجرے میں مقید ہوں۔
سانس کا پنچھی پھڑ پھڑا تا رہتا ہے۔
رات تاریک ہے........ ان گنت صدیوں سے سورج طلوع نہیں ہوا۔
چاروں اُور میزائل نصب ہیں۔
اور میزائل بھی وہ جو" جوہری اسلحہ " لے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔
مجھے کئی راتوں سے نیند نہیں آرہی۔
شاید صدیوں کا رتجگا ہے۔
میری نیند میں ایک چیخ ہے.... رہائی کی........!
کوئی ہے....؟
کوئی ہے....؟
آواز تو دو....!
کوئی ہے........؟

مرصّع آئینے

گھڑولی سر پر رکھے،

پیلے غرارہ سوٹ میں لپٹی وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں سب سے آگے تھی۔ اٹھلاتی، مسکراتی، گاگر چھلکاتی وہ خود تو گزر گئی، لیکن پائل کی چھنکار نقشِ پا کے ساتھ ہی چھوڑ گئی۔ سہیلیوں کے جھرمٹ میں جب وہ گھڑولی بھر کر لوٹی تو ستواں ناک میں ننھی سی نتھلی کانپ رہی تھی۔ گھڑولی سے چھلکتا پانی گالوں پر اٹھکیلیاں کرتا، تھوڑی دیر کو ٹھوڑی پر ٹھہرتا، قطرہ قطرہ دامن میں گر رہا تھا۔ وہ جیسے ہی ہمارے پاس آ کر رکی، پائل کی جھنکار تھم گئی۔ مغلیہ عہد کی شہزادیوں کی مانند اس نے خم دار سلام کیا اور یہ کہتی ہوئی جھرمٹ میں جا شامل ہوئی،

" گھڑولی پہنچا کر میں ابھی آئی....."

اس کے جسم میں بے قراریاں کروٹیں لے رہی تھیں۔ گھڑولی میں آئینے جڑے تھے، رنگ بھرے تھے۔ میں اس کی پشت دیکھتا رہا۔ گھڑولی چھلک رہی تھی۔ وہ بھی اپنی چھلکتی جوانی سے بے خبر چھلکتی جا رہی تھی۔ قوسِ قزح کے سارے رنگوں میں اس کا رنگ جدا تھا۔

فیض احمد کا قد ساڑھے چھ فٹ، چوڑے شانے، کشادہ پیشانی، بائیں ہاتھ کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی، تِلے دار کھسّہ پہنے، کاندھوں پر گرم شال ڈالے، وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کے چٹخارے نکال رہا تھا۔

چلئے، اندر چل کر بیٹھتے ہیں، خنکی بڑھ رہی ہے۔ وہ اٹھا تو پیرالوئس کے ناول "افروڈائٹ" کا کردار لگ رہا تھا۔ سورج کی دم توڑتی کرنیں آنگن میں پھیلے بیری کے درخت سے چھن چھن کر اس کی شال میں جذب ہو رہی تھیں۔ آتشدان میں انگارے دہک رہے تھے۔

وہ چھم چھم کرتی لوٹ آئی تو ابھی ہم دونوں خاموش، سوچ ہی رہے تھے کہ گفتگو کا سلسلہ کیسے چلے.....

وہ موڑھا گھسیٹ کر بے تکلفی سے ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے کانوں میں زرد

آویزے تھے۔ ایک کان سے آویزہ اتار کو اس نے ہتھیلی پر رکھا اور اس سے کھیلنے لگی۔

فیض احمد سے متعارف ہیں، آپ....؟

نہیں....

یہ میرے ماموں زاد ہیں۔ سگے ماموں زاد اور جاگیر دار بھی! اس سال ان کی کپاس کی فصل بہت اچھی ہوئی ہے اور یہ ملک کا قرض اتارنے کی بجائے بیرون ملک سیر کو جا رہے ہیں۔

فیض احمد نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

اور.... آپ امداد ہیں، افسانہ نگار۔

افسانے لکھتے اور خواب کاشت کرتے ہیں۔ فیض احمد تم نے کبھی خوابوں کی فصل کاشت کی ہے....؟

ہم وہ فصلیں کبھی کاشت نہیں کرتے جو منافع بخش نہ ہوں۔ اگر کبھی خواب کاشت کیا تو پھر اس کی فصل بھی کاٹیں گے۔ ہم لڑکیاں باتونی بہت ہوتی ہیں.... ہیں، نا....؟ ساتھ ساتھ آپ بھی کچھ نہ کچھ بولیئے، نا....!

امداد کا تعارف تو مکمل کیجئے........

کیا اتنا کافی نہیں کہ یہ افسانہ نگار ہیں۔ اب تم چپ کی چادر اتار پھینکو۔ ان سے باتیں کرو، تاکہ انہیں میرے گاؤں میں اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ میں کل کا پورا دن ان کے نام لکھ دوں گی۔ تانگے پر انہیں گاؤں کی سیر کراؤں گی۔ اس بوڑھے دہقان سے بھی ملاؤں گی جو کالج جاتے ہوئے مجھے راستے میں روز بان کی ٹوٹی چارپائی پر کھانستا ہوا ملتا ہے۔ وہ برسوں سے کھانس رہا ہے۔ ان کا مقدر ہی صرف کھانسنا اور حقہ بھرنا ہوتا ہے۔ یہ حقے کے اُپلے ہیں جو بس سلگتے اور راکھ ہوتے ہیں۔ وہ کھانس رہا ہے اور جی رہا ہے۔ اس کی جوان پوتی مترو کمہار کے ساتھ بھاگ گئی ہے، وہی اس کا آخری سہارا تھی۔ بیٹا اس کا وڈیروں کی لڑائی کا ایندھن بن گیا۔ میں نے کئی بار افسانہ لکھنے کا سوچا ہے، لیکن لکھ نہیں سکی۔ میں سوچ تو سکتی ہوں، کڑھ تو سکتی ہوں، لکھ نہیں سکتی۔ جانے کیوں....؟ وہ آویزہ انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی چٹکی میں پکڑے، ہلاتی بے تکان بول رہی تھی۔

علیزہ باتونی بہت ہے۔ محسوس مت کیجئے گا۔ دراصل بچپن میں جس کا ڑھنی میں اس کا دودھ

رکھا تھا، اس میں کوّا منہ مار گیا۔ بس تب سے یہ بولتی ہے تو بولتی ہی چلی جاتی ہے۔

فیض احمد کی آواز میں بے تکلفی کی کھنک تھی۔

اچھا ٹھہریئے، میں آپ کو ایک نظم سناتی ہوں.... علیزہ نے پستہ توڑتے ہوئے کہا....

عنوان ہے "بُندا" اور شاعر ہیں.... مجید امجد

کاش میں تیرے بن گوش میں بُندا ہوتا

رات کو بے خبری میں جو مچل جاتا میں

تو ترے کان سے چپ چاپ نکل جاتا میں

صبح کو گرتے تری زلفوں سے جب باسی پھول

میرے کھو جانے پر ہوتا ترا دل کتنا ملول

تُو مجھے ڈھونڈتی کس شوق سے گھبراہٹ میں

اپنے مہکے ہوئے بستر کی ہر اک سلوٹ میں

جونہی کرتیں تری نرم انگلیاں محسوس مجھے

ملتا اس گوش کا پھر گوشۂ مانوس مجھے

کان سے تو مجھے ہر گز نہ اتارا کرتی

یوں تری قربتِ رنگیں کے نشے میں مدہوش

عمر بھر رہتا میری جاں میں تیرا حلقہ بگوش

کاش میں تیرے بن گوش کا بُندا ہوتا۔

میں سوچنے لگا، کیا پائل کی جھنکار اس کے نام کی ہے؟ زاویے اور خطوط اس کے نام پر بولتے ہیں۔ میرے سامنے علیزہ کے مرصّع خطوط اور فیض احمد تھے۔ ہر زاویہ ایک مرصّع آئینہ تھا۔ آئینے چور چور اور سوچیں ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ کرچیاں چننا اور ریزے سمیٹنا میرے بس میں نہ تھا۔ میں اپنی بہن کو کس اعتماد سے لایا ہوں، اپنی پسند اور مستقبل کا ساتھی دکھانے اور میرا مستقبل کسی اور کی آنکھ سے جھانک رہا ہے....! واہموں کے شہر میں، میں گلی گلی راستہ ڈھونڈنے لگا۔ ہر گلی بند تھی۔ یہ بھی تو ممکن ہے وہ صرف میری ہو.... وہ کسی اور کے نام کی تحریر نہ ہو۔ اگر علیزہ فیض احمد کے نام کی تحریر ہوتی تو ہتھیلی پر آویزہ رکھ کر مجید امجد کی نظم کیوں سناتی....؟ یہ.... یہ.... فیض احمد

.... کتنا شانت بیٹھا ہے، جیسے گھڑولی چھلکاتی وہ پوری اسی کی ہو۔

آتش دان کی حدّت کم ہونے لگی.... فیض احمد نے کندھوں پر چادر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

افسانہ نگاری کا شغل کب سے ہے؟

فن کی عمر کا تعیّن کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وقت کی قید سے ماوراء ہوتا ہے۔ اس کے پیمانے آپ کی دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ فن کسی ایک صدی کے کنویں میں بند نہیں رہتا۔ اسے شاید اتنی گاڑھی گفتگو کی امید نہیں تھی۔ اس نے سگار سلگایا اور کہا،

میں چند روز میں بیرونِ ملک سفر پر نکل رہا ہوں۔

کہاں کا ارادہ ہے؟

کہیں بھی.... آوارہ گردی جو کرنی ہے۔ زندگی کی آخری سانسوں سے لطف اٹھانے کے لئے کہیں بھی نکل جاؤں گا۔

آخری سانسیں....؟

آپ سے شاید یہ آخری ملاقات ثابت ہو....

وہ کیسے....؟

مجھے کینسر ہے....

اس کی آواز میں کہیں لرزش نہیں تھی۔ سپاٹ اور سادہ آواز، تاثر سے عاری جیسے اس نے دو کالمی خبر سنائی ہو۔

کیا آپ جو کہہ رہے ہیں اسے سمجھ بھی رہے ہیں؟

"جی ہاں، یہ بات طے ہے کہ یہ زمین ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں ہے۔ میں سانس لینے کے عمل سے گزر رہا ہوں، زندہ رہنے اور سانس لینے میں بہت فرق ہے۔ میرے پاس ایک سال ہے، اس سے کچھ کم یا تھوڑا زیادہ گنے چنے سانس....!

آپ نے کبھی درختوں کی زندگی پر غور کیا ہے؟

نہیں....

تو پھر آپ افسانے کیسے تراشتے ہیں؟ ہر ٹہنی، ہر پتہ ایک مکمل کہانی ہے.... درخت کا رہن

ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں اور آکسیجن خارج کر کے ہماری زندگی کا سامان کرتے ہیں اور ہم .... ہم کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کر کے پورے ماحول کو مسموم کرتے ہیں.... زندگی کو قریب سے دیکھا کیجئے۔

"مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے، آپ میر امن دہلوی کی" باغ و بہار" سنا رہے ہیں....!

ہم دونوں اس چھت کے نیچے ہیں اور ہمیں رات گزارنی ہے۔ وہ چار درویش تھے۔ ہم دو ہیں۔ شاید میں آپ کے حصے کی کہانی تو نہ سن سکوں، مگر میرے حصے کی کہانی آپ بحیثیت کہانی کار سن لیجئے۔ اب کوئی بادشاہ تو یہاں آنے سے رہا جو بھیس بدل کر ریاست کی خبر گیری کرے اور ہماری بپتا سنے۔ ہمیں تو خود ہی ایک دوسرے کو اپنی کتھا سنانی اور رات گزارنی ہے۔ میں نے آپ کی تحریریں، افسانے اور خطوط دیکھے ہیں....!

علیزہ آپ کے بہت قریب ہے....! وہ مسکرایا، مجھے نہیں معلوم وہ امرتا پریتم ہے کہ نہیں لیکن آپ اس کے لئے ساحر ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آپ ہی کے خواب ہیں۔

اس کی باتیں سن کر میرے اندر سر اٹھاتے اندیشوں نے دم توڑ دیا۔ میں کیا سوچ رہا ہوں اور فیض احمد کیا کہہ رہا ہے؟ یہ لڑکیاں اتنی گنجلک کیوں ہوتی ہیں۔ انہیں پڑھنا آسان کیوں نہیں ہوتا۔ یہ اپنی تحریریں دل کے کن لاکروں میں بند رکھتی ہیں؟ کون اہم ہے؟ میں یا فیض احمد...؟

علیزہ چائے لے کر آ گئی۔ ساتھ میں اس کی امّی بھی تھیں۔ انہوں نے بوڑھوں سے لے کر گھر میں نئے آنے والے مہمان کی آمد تک کا حال پوچھ ڈالا۔ ہمارا ملنا بھی اب برسوں میں بس انہی مواقع پر رہ گیا تھا۔

علیزہ لمبی چوٹی گوندھے، دوپٹے سے بے نیاز چائے بنانے میں مگن تھی۔ چائے، چلغوزے اور مونگ پھلی کا دور چلتا رہا اور میں یہ سوچتا رہا کہ علیزہ کس کا مقدر ہے؟

رات گئے وہ اٹھ کر گئیں تو ہم کمرے میں تنہا رہ گئے۔ فیض احمد نے شال اتار کر ایک طرف رکھی اور لحاف اوڑھ لیا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی...

میں نے برسوں جن خوابوں کی آبیاری کی تھی، وہ مرجھا چلے تھے۔ علیزہ کی ساری یادیں Puzzle کی طرح بکھر گئیں۔ میں نے Puzzle کے ٹکڑے جوڑنے کی اپنی سی کوشش

کر دیکھی، کوئی تصویر مکمل نہیں ہو رہی تھی۔ ٹکڑے جوڑتے جوڑتے جانے کتنی رات گزر گئی۔

اگلی صبح علیزہ ہمیں وسیع و عریض حویلیوں کی بھول بھلیوں سے گزار کر اپنے گھر لے گئی۔ دسمبر کی ٹھنڈی دھوپ میں اس کے ابّو صحن میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ فیض احمد کو ان کے پاس چھوڑ کر مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔

یہ کارپٹ ابّو لائے ہیں۔ الماری امّی نے لے کر دی ہے۔ پردے میری پسند کے ہیں۔ کمرے کا رنگ آپ کی پسند کا ہے۔ وہ عجائب گھر میں رکھی چیزوں کی طرح تفصیلات بتاتی رہی... کارنر سٹینڈ پر رکھا بھالو اور شیشے کے نفیس ظروف، کرسٹل کا سامان...... اور مغربی کونے میں موجود بانس سے بنا گھر... یہ فیض احمد نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ دیکھئے، کتنی نفاست ہے اس میں... میں نے بانس کے اس گھر کو قریب سے دیکھا۔ کوئی دروازہ میرے نام کا نہیں تھا... تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر دستک دی لیکن مکان کے اندر گہری چپ اور سنّاٹا تھا۔ تمام دروازوں اور کھڑکیوں کا ڈیزائن فیض احمد کے نام کے انگریزی ہجوں سے بنا ہوا تھا۔

باہر صحن میں فیض احمد سگار پی رہا تھا اور اندر کمرے میں دھواں تھا۔ ہر چیز دھندلا رہی تھی۔ اور میرا دم گھٹ رہا تھا۔ چائے پی کر ہم نکلے تو کوچوان تانگہ جوت چکا تھا۔ مسجد کے پہلو سے گزر کر اس نے تانگہ رکوایا۔ مالٹے لئے، ریڑھی والے سے میرا تعارف کرایا۔ اس نے مجھے کھانستے اور خون تھوکتے ہوئے دہقان سے ملایا، پگڈنڈیوں پر سے گزر کر مالٹے کے باغ کی سیر کرائی... مجھے حیرانی ہوئی کہ باغات ان کی ذاتی ملکیت ہیں، تو ریڑھی والے سے اس نے مالٹے خرید کیوں کئے؟

آپ نے مالٹے کیوں خریدے؟ میں نے سوال کر ہی دیا۔

میرے چند روپوں سے شاید شام کو اس کا چولہا جلتا رہے۔ کسی کی دوائی آ جائے... اور... اور...

میری نظروں میں اس کا قد اور بلند ہو گیا......

ہم سیر سے لوٹ کر حویلی میں داخل ہوئے تو فیض احمد رخصت ہو رہا تھا...

شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ علیزہ کے کمرے کی کھڑکیوں پر نمی اترنے لگی۔ آسمان پر بادل گھر آئے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ میز پر خشک میوے چُنے تھے۔ وہ

چلغوزے کا چھلکا اتارتے ہوئے بڑے ٹھہراؤ سے بولی۔

مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے......!

زہے نصیب...

وہ اٹھی، الماری کھول کر ایک فائل نکالی اور میرے سامنے لا رکھی۔ یہ آپ کے خطوط ہیں ... میں لوٹا نہیں رہی، امانت آپ کے سپرد کر رہی ہوں۔ میرے لوٹ آنے تک سنبھال کر رکھیئے گا۔

تم جا کہاں رہی ہو...؟

مجھے آپ سے محبت ہے۔ شدید اور گہری محبت۔

آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا...

میں نے سر ہلایا، حالانکہ میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔ فیض احمد کو کینسر ہے اور اب کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے۔ وہ دس سال کا تھا کہ اس کی ماں چلی گئی۔ چند سال بعد ماموں نے بھی رختِ سفر باندھا اور اپنے رب سے جا ملے۔ اس نے محرومیوں کے سائے میں زندگی گزاری ہے۔ مجھے اپنی زندگی سے صرف اتنی سانسیں ادھار دے دیجئے، جن سے فیض احمد کی اجڑی زندگی میں بہار آ جائے۔ میں نے صرف آپ کو سوچا ہے۔ چاہا اور پوجا ہے۔ اسی محبت کی بھیک مانگتی ہوں آپ سے! مجھے فیض احمد سے شادی کی اجازت دے دیجئے۔ باقی زندگی تو میں آپ کے نام کر چکی ہوں اور ہاں یہ خیال دل میں مت لائیے گا کہ مجھے بیرونِ ملک گھومنے کا شوق ہے..... دراصل فیض احمد کو کہیں سے پیار نہیں ملا۔ آپ اسے ہمدردی کہہ لیں..... کوئی اور نام دے لیں۔ مگر مجھ سے اس کی یہ تنہائی دیکھی نہیں جاتی اور جب سوچتی ہوں کہ فیض احمد زندہ نہیں رہے گا تو اپنا آپ بہت چھوٹا محسوس ہونے لگتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا.....!

کافی کپ کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میرے خواب میرے سامنے بکھر رہے تھے۔ وہ میرے ظرف کو آزما رہی تھی..... میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا۔ چپ چاپ اس کی آنکھوں میں اپنے نام کی کوئی کرن تلاش کرتا رہا۔ ان آنکھوں میں کون تھا؟

میں یا فیض احمد.....؟

اگلی صبح ہم لوٹ آئے اور علیزہ نے فیض احمد کے نام کی انگوٹھی پہن لی۔

ایک ہفتہ بعد وہ پرواز کر گئی.....

میں نے دیوار میں کیل ٹھونکی اور کیلنڈر کے ساتھ انتظار کی سولی پر لٹک گیا.....

اسے گئے ہوئے ابھی دوسرا دن تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔

دوسری طرف علیزہ تھی.....

امداد..... فیض احمد کو کینسر نہیں ہے۔اس نے محض مجھے حاصل کرنے کے لئے ساری کہانی گھڑی تھی۔ یہ تم سے بڑا کہانی کار نکلا ہے..... اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں..... سچی میں بہت پریشان ہوں..... تم بتاؤ، تمہارا کیا حال ہے؟..... امداد، آسٹریا بہت خوبصورت ہے..... پہلی بار زندگی کا صحیح مفہوم سمجھ میں آیا ہے۔ہیلو..... امداد..... ہیلو..... ہیلو، تم بولتے کیوں نہیں..... امداد.....؟

پچھلا دروازہ

السلام علیکم ۔۔۔۔۔! یا اہل القبور ۔۔۔۔۔

وہ جب قبرستان کی چاردیواری میں داخل ہوا تو السلام علیکم ۔۔۔۔۔ یا اہل القبور کہنے پر اسے جواب میں سلامتی کی دعا ملی تو زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ سوچنے لگا مٹی کی ان ڈھیریوں میں سے وہ کون سی ڈھیری ہے ۔۔۔۔۔؟ جہاں سے اس کے سلام کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ آواز کہاں سے آئی ہے ۔۔۔۔۔؟ اسے اپنی سماعت پر شک کا گماں گزرا، وہ شک اور یقین کے درمیان معلق مُردہ کتبوں پر لکھے زندہ نام پڑھنے لگا۔ بہت سی قبریں بے نام تھیں۔ ان کے سرہانے یاد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ وہ اپنے حصے کی زمین کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ کیا مجھے بھی یہیں دفن ہونا ہے ۔۔۔۔۔؟

اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔

کون زندہ ہے ۔۔۔۔۔؟

میں ۔۔۔۔۔؟

یا ۔۔۔۔۔! مٹی کی وہ ڈھیری جس میں سے آواز آئی ہے۔

اس نے تین بار سورۃ فاتحہ اور گیارہ بار سورۃ اخلاص پڑھی ۔۔۔۔۔ اور ثواب سب کے نام کیا ۔۔۔۔۔ سب کے نام ۔۔۔۔۔! جن کو جانتا تھا اور وہ بھی جو گم نام اور بے نشان تھے۔ اسے ایسے لگا قبروں کے منہ کھلنے لگے ہیں۔ ان نے آنکھیں موند لیں۔ وہ صرف کتابی علم کے سہارے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی میں موت کا تناسب اس کی عمر سے متجاوز ہونے لگا تو اس نے قبرستان کی سیر کو معمول بنالیا ۔۔۔۔۔ بیالیس برس کی عمر میں اس کے دل کے قبرستان میں تینتالیس قبریں بن گئیں ۔۔۔۔۔! یہ حادثہ اکتالیس برس کی عمر میں اسے پیش آیا جب اس کی

دادی ماں اور ماں ایک ہی برس میں اسے چھوڑ گئیں تو قبور کی تعداد اکتالیس سے بیالیس ہو گئی۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اسے اپنے مسکن کی تلاش تھی جہاں اسے سکون ملے۔۔۔۔۔آرام اور آسودگی۔۔۔۔۔!

لیکن سرائے تو ویران ہو گئی۔

سرائے میں مقیم مکینوں میں سے اس کے باپ نے دس سال پہلے عدم آباد کو جا آباد کیا اور دادی اماں کے بعد کٹیا میں ماں کے بیمار چراغ سے پوری روشنی تھی۔ ماں کے بعد تو۔۔۔۔۔

دل کا یہ حال ہوا تیرے بعد
جیسے ویران سرا ہوتی ہے

ماں کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ دنیا ایک ویران سرا ہے۔ گھڑونچی پر رکھے گھڑے میں پانی خشک ہو گیا، چھپر تلے چڑیوں کے گھونسلوں میں ان کے بچے مر گئے، آنگن میں لگے شرینہہ اور شیشم کے درختوں کو دیمک چاٹ گئی، صحن میں لگے ہینڈ پمپ کا پانی گر گیا، کمروں میں چمگادڑوں نے بسیرا کیا، اس کے والد کی دونالی بندوق کے لکڑی کے دستے کو دیمک خوراک سمجھ کر چٹ کر گئی، گھر کی بوسیدہ دیواروں میں موت رینگنے لگی۔ اس نے ایک دن اپنے والد کی بوسیدہ ڈائری کے اوراق آہستگی اور نرمی سے کھولے تو ایک شعر پڑھ کر بہت رویا۔

جان کر منجملہ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ماں کی الماری میں قرآن، سیپارے، درود شریف کی کتابیں، کروشیہ، اُون، سلائیاں، کڑھائی کے گول فریم، تسبیحیں اور ایک تاگے میں تسبیح کے پروئے سات دانے جو اس کی ماں نے عمرے کی ادائیگی کے دوران خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے ہر چکر کی گنتی شمار کرنے کے لیے ساتھ رکھ لیے تھے۔ سرا سے جاتے ہوئے کوئی بھی تو اپنی جائداد ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔

کس قبر سے سلامتی کی آواز آئی ہے۔۔۔۔۔؟

ابو۔۔۔۔۔ماں۔۔۔۔۔یا۔۔۔۔۔دادی اماں۔۔۔۔۔؟

اس نے وہیں بیٹھ کر مٹی کی زندہ ڈھیری کو اس یقین کے ساتھ کہ اس کی ماں اس کی آواز سن رہی ہے۔۔۔۔۔پکارتے اور جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

ماں ۔۔۔۔۔تمہارے جانے کے بعد کائنات بے روح ہوگئی ہے، چہرے ساکت، آسمان چُپ، ستارے بے نور، سورج زرد، شجر خزاں رسیدہ اور ہوائیں نوحے رقم کرتی اور گُرلاتی رہتی ہیں۔

ماں ۔۔۔۔۔

میرے گھر اور شہرِ خموشاں کے درمیان سو پچاس قدموں کی مسافت ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں

میرا مسکن کون سا ہے ۔۔۔۔۔؟

یہ گھر جس میں صرف سانس لینے کا عمل باقی رہ گیا ہے

یا شہرِ خموشاں ۔۔۔۔۔؟

جسے تم نے جا آباد کیا ہے۔

میں ایک بے آباد گھر کا باسی ہوں۔

ماں ۔۔۔۔۔

بتاؤ ۔۔۔۔۔ نا

ہمارا مسکن کہاں ہے ۔۔۔۔۔؟

یہ گھر ۔۔۔۔۔؟ یا ۔۔۔۔۔ شہرِ خموشاں ۔۔۔۔۔؟

اگر یہ گھر مسکن ہے تو تم کیوں رختِ سفر باندھ گئیں

اور اگر شہرِ خموشاں مسکن ہے

تو ۔۔۔۔۔

ہم اس بے آباد گھر میں کیوں سانس لینے کے عذاب سے گزر رہے ہیں ۔۔۔۔۔؟

ماں ۔۔۔۔۔

دو جہانوں کے درمیان بچھی مسافت نا معلوم ہے۔

اس مسافت کو طے کرنے میں جانے ابھی اور کتنی سانسوں کا ایندھن پھونکنا ہے۔

ماں ۔۔۔۔۔

ہجر اور ملن کے درمیان بچھی صدیوں کی صف پہ ساری عمر سجدہ ریز رہوں تو بھی تمھارا حق

ادا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔

تم وقت کی قید سے پرے جا آباد ہوئیں۔۔۔۔۔

اور میں۔۔۔۔۔

ہجر کے پیڑ تلے بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔

زمین گزر گاہ ہے، ہمارا مسکن نہیں۔

ماں۔۔۔۔۔ تمھارے بعد بے روح عمارتوں کے درمیان گھومتے ہوئے خیال آتا ہے، زمین ہمارا ٹھکانہ نہیں، پھر بھی ہم حقِ ملکیت جتاتے جتاتے عمرِ رواں کے سارے اوراق بے ترتیب کر لیتے ہیں اور ایک روز سارے اوراق پریشان ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔

خزاں اُتر آتی ہے۔۔۔۔۔۔

جیسے تمھارے جانے کے بعد سارے درختوں کے پتے جھڑ گئے۔

ماں۔۔۔۔۔

تمھیں پت جھڑ کے موسموں میں ہی جانا تھا

تمھارے بعد موسم نہیں بدلے۔

ماں۔۔۔۔۔ میری باتیں سن رہی ہو۔۔۔۔۔ نا۔۔۔۔۔ میں اس لیے اب تمھارے پاس آنا چاہتا ہوں کہ نوکیلی دھوپ میں تمھارے پیار کے آنچل کے بغیر زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔

وہ جانے کتنی دیر۔۔۔۔۔ ماں سے۔۔۔۔۔۔ پھر باپ سے اور دادی ماں سے باتیں کرتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی باتیں سنی جا رہی ہیں۔۔۔۔۔

زندگی میں تو کسی کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ کوئی اس کی باتیں سنتا۔ سب کے اپنے دھندے پسارے تھے، اپنی الجھنیں اور مسائل تھے۔۔۔۔۔ بس ایک یہی شہر تھا، شہرِ خموشاں۔۔۔۔۔ جہاں وہ اپنے دل کی باتیں لے کر آ نکلتا۔

لیکن آج تو ان ہونی ہو گئی۔۔۔۔۔

اسے اس کے سلام کے جواب میں سلامتی کی دعا ملی تھی۔۔۔۔۔ اس کا پلٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ یہیں بس جانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ جہاں جھوٹ تھا نہ غیبت، ہوس تھی اور نہ ہی منافقت۔۔۔۔۔ لالچ تھا۔۔۔۔۔ نہ خود غرضی۔۔۔۔۔

پھر یہاں اس کا باپ تھا۔۔۔۔۔

دادی اماں۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔ماں۔۔۔۔۔!

واپس پلٹ کر کیا کرنا تھا۔۔۔۔۔

لیکن سب سے بڑا سوال جو اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا کہ موت کس دروازے سے آئے گی۔۔۔۔۔؟

کیا وہ یہ دروازہ خود سے کھول لے۔۔۔۔۔؟

اسے جھرجھری سی آ گئی۔۔۔۔۔

اس نے دروازے کے پٹ پر ہاتھ رکھا تو لرز گیا۔۔۔۔۔

اِدھر کا منظر دیکھنا اس کے بس میں نہ تھا۔۔۔۔۔

اس نے پلٹ کر پچھلے دروازے کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔تو اس کے معصوم بچوں کی نرم کومل مسکراہٹیں اسے واپس بُلا رہی تھیں۔۔۔۔۔!

ایک سوا کیاون

کمرے کے شمال مغربی کونے میں اس کے ابو کا پلنگ بچھا تھا۔ سرہانے کی سمت دیوار پر تیل کا نشان تھا۔ اب وقت کی دھول سے اس کا رنگ مٹیالہ ہو چلا تھا۔ اس کے ابو اخبار اور رسائل کے مطالعے کے دوران اپنے سرخ کڑھائی والے عربی رومال کا سینو بنا کر سر کے نیچے رکھ لیتے اور باقاعدگی سے بالوں میں تیل لگانے کی وجہ سے دیوار پر ان کے سر کی پشت کا نشان زندہ رہ گیا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے سونے کے لیے پلنگ کی جگہ بدلی تو بہت نرمی اور آہستگی سے اس نشان کو چھو کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس کی بیٹی پاس ہی کھڑی تھی۔

ابو۔۔۔۔۔آپ کیوں روئے۔۔۔۔۔؟

بیٹا۔۔۔۔۔ یہ دیکھو میرے ابو کی نشانی۔ ابو کا پلنگ ہمیشہ اسی کونے میں رہتا تھا۔ وہ چیزوں کی ترتیب بار بار بدلنے کے قائل نہیں تھے۔

ابو آپ کو بھی اپنے ابو اسی طرح اچھے لگتے ہوں گے جیسے آپ ہمیں اچھے لگتے ہیں ۔۔۔۔۔بیٹی نے معصومیت سے پوچھا۔

جی بیٹا۔۔۔۔۔!

اس نشان کو اس نے اسی محبت، عقیدت اور احترام سے چوما جیسے اس نے ابو کی پیشانی کو سفرِ آخرت کے وقت بوسہ دیا تھا۔ آنکھ کے کونے پر ٹھہرے ہوئے آنسو کو اس نے شہادت کی انگلی سے سمیٹتے ہوئے بیٹی سے کہا۔۔۔۔۔''بیٹا تمہارے دا ابو بہت عظیم تھے۔''

ابو آپ نے اسی لیے دا ابو کی جوتی، جرابیں، پرفیوم، عطر، گھڑی، کپڑے، کپڑوں کا وہ

آخری جوڑا ابھی جو ایکسیڈنٹ کے روز وہ بدل کر گئے تھے، قراقلی ٹوپی، سگریٹ لائیٹر، سگریٹ کیس اور بندوق سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔

بیٹا۔۔۔۔۔اس خزانے میں اب بندوق نہیں ہے۔

کیوں ابو۔۔۔۔۔؟

جب تمہاری دادو کو Pancreas کا کینسر ہوا تھا۔۔۔۔۔نا، اس وقت مالی مسائل کی وجہ سے اسے چودہ ہزار روپے میں بیچ دیا۔اتنی قیمتی متاع میں نے کوڑیوں کے مول بیچ دی۔۔۔۔۔ صرف چودہ ہزار۔

ابو وہ ہماری دادو سے زیادہ قیمتی تو نہیں تھی۔۔۔۔۔نا۔۔۔۔۔بیٹی نے کہا۔

بیٹا ماں باپ کی ہر چیز، باتیں، یادیں، دوست احباب، ان کی استعمال شدہ چیزیں، گھر اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔قبریں تک۔۔۔۔۔انمول ہوتی ہیں۔

اس کی بیٹی ماں کے آواز دینے پر باہر چلی گئی۔

بیٹی پوچھ رہی تھی۔۔۔۔۔ابو جب یہ کمرہ پینٹ کرایا جائے گا، یہ نشان تو مٹ جائے گا۔ بیٹی ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔اس نشان کو باقی رکھنے کے لیے کمرہ پینٹ ہی نہ کرایا جائے۔

ابو جس عجلت اور تیزی سے زندگی کے مسائل نمٹاتے تھے، اسی تیزی سے انھوں نے آخرت کا سفر باندھا۔اس کے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ اس کے ابو خوابوں میں اسے تواتر سے ملتے رہے۔کوئی ایک خواب بھی ایسا نہیں تھا جسے خواب کہا جاسکے۔سب پر حقیقت کا گماں گزرتا تھا۔ابو کا وہی اجلا لباس، قراقلی ٹوپی، واسکٹ، جوتیوں کی چمک، رے بین کی عینک، کبھی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک کھال پر کبھی دوسرے کھال پر، کبھی سنبل اور شیشم کے درختوں کے درمیان، بیٹے سے سوال کرتے ہوئے "میرے جانے کے بعد تم تکلیف میں تو نہیں ہو۔۔۔۔۔؟" تو کیا ماں باپ مرجانے کے بعد بھی زندہ ہوتے ہیں، خبر گیری کرتے ہیں۔۔۔۔۔!

ان کا تعلق ایک انتہائی سفید پوش اور متوسط گھرانے سے تھا۔اس کے والد سادگی کا بے مثال نمونہ تھے۔گھر میں تہہ بند باندھتے، کرتہ اور سر پر سرخ کڑھائی والا رومال لپیٹ لیتے۔ زمین چند ایکڑ تھی۔گھر میں خوش حالی تو نہیں تھی لیکن عسرت بھی نہیں تھی۔اس کے ابو جب صبح موٹر سائیکل پر قریبی شہر اپنے کاموں سے نکلتے تو اجلے کپڑے پہن کر، سر پر قراقلی ٹوپی لیتے

اور ریے بین کا چشمہ لگاتے۔ ان کا مزاج انتہائی نفیس تھا۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ عمر کے پچاسویں سال میں بھی وہ جوان نظر آتے تھے۔ زندگی میں نہ کبھی کسی کے سامنے اپنے مسائل کا رونا رویا اور نہ ہی ہاتھ پھیلایا۔ وہ قناعت کے بہت اونچے منصب پر فائز تھے جو کم کم ہی کسی کے نصیب میں آتا ہے۔ ماں کھانے کے دوران جو بھی سامنے لا کر رکھ دیتی چپکے سے کھا لیتے۔ کبھی مین میخ نہیں نکالی۔ پوری زندگی میں ایک بھی دن ایسا نہیں تھا جب اس کے ابو نے کھانے پر اعتراض کیا ہو۔ معترض ہونا ان کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔ لگتا تھا، ان کا خمیر قناعت اور صبر کی مٹی سے گوندھا گیا ہے۔ سالن میں اگر مرچ نمک ذرا تیز ہوتی یا ذائقہ ان کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتا تو امی کو آواز دے کر اتنا کہتے، بی بی دودھ کا گلاس لا دو۔۔۔۔۔!

گرمیوں میں باقاعدگی سے صبح ناشتے میں آم نچوڑ لیتے۔ اس میں چینی ملاتے اور دیسی گھی اور اسی سے ناشتہ کرتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ گرمیوں کی دوپہر میں لسی اور مکھن ضرور لیتے۔ کبھی کبھی مکھن میں شکر ملا لیتے۔ سردیوں میں بچوں کے لیے میوہ جات چلغوزے، اخروٹ، پستہ اور بادام باقاعدگی سے لاتے۔ ان کی پوتیاں اور نواسیاں جیب میں ہاتھ ڈال کر کھلکھلا کر ہنستیں تو وہ بہت خوش ہوتے۔

ابو نے ٹریکٹر خرید کیا تو یہ وہ عہد تھا جب دور دور تک کسی کے پاس ٹریکٹر کی سہولت موجود نہ تھی۔ لوگ دور دور سے دیکھنے کو آئے۔ پہلا سائیکل اور موٹر سائیکل بھی علاقے میں ان ہی کا مقدر ٹھہرا۔ ٹریکٹر کے آجانے سے گھر میں خوش حالی آ گئی۔ زمین کی بیجائی میں بھی آسانی ہو گئی۔ ماں رقم پس انداز کر کے بیٹیوں کے جہیز کے لیے چیزیں جوڑ جوڑ رکھنے لگی۔ ابو کے لباس، انداز اور طرزِ زندگی میں سرِ مو فرق نہ آیا۔ لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے کہ ٹریکٹر کے آجانے سے ان کے گھر ہُن برسنے لگا ہے۔ غلے کے ڈھیر دیکھ کر حاسد حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ انھوں نے تعویذ گنڈے کا سہارا لے کر اس گھر کو برباد کرنے کی اپنی سی کوشش کر دیکھی۔ لیکن اللہ حفاظت کرے تو سانچ کو آنچ نہیں۔

ایک دن اس کی ماں نے پوچھا۔۔۔۔ ٹریکٹر کی بہت زیادہ آمدن ہوتی ہے کیا ۔۔۔۔؟

نہیں بی بی، لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کرو۔ اللہ نے دال روٹی دے رکھی ہے۔

صبر شکر کیا کرو، سفید پوشی کا بھرم قائم ہے۔

اسی سفید پوشی کے بھرم کے قائم رکھنے کو بیٹیوں کی شادی پر تیس ایکڑ زمین بک گئی۔ تا کہ وہ اپنے سسرال میں آسودہ رہیں۔ چنیوٹ سے فرنیچر بن کر آیا۔ جس نے دیکھا، انگشت بدنداں رہ گیا۔ بیٹیوں کی رخصتی آن بان اور شان سے ہوئی۔ بیٹیوں کی رخصتی کے بعد پھر وہی زمین، دولت اور امارت کے بارے لوگوں کی چہ مگوئیاں اور اس کے ابو کی وہی بُردباری، تحمل اور قناعت ــــــ گھر میں سادگی اور معمولاتِ زندگی معمول پر۔

اس کے ابو کی کل کائنات لکڑی کی ایک الماری اور چمڑے کا خاکستری رنگ کا بکس تھا۔ بکس میں کبھی چار سے پانچ جوڑے کپڑوں کے نہ ہوئے۔ استری شدہ تہہ بہ تہہ رکھے ہوئے کپڑے، واسکٹ کی تعداد ہمیشہ دو ہی رہی۔ بوسکی کا ایک کرتہ، تین چار عدد بنیان جس میں جیب لگے تھے، ابوان کو ''پھتوئی'' کہا کرتے تھے اور دو ایک جیب والے رومال۔

ایک دن ماں نے پوچھا ــــــ ''بیٹیاں تو اپنے گھر کو سدھاریں، بیٹے کے لیے کچھ پس انداز کیا ہے؟''

تربیت اور تعلیم کے لیے جو مجھ سے بن پڑا، میں نے کمی نہیں کی۔ آگے اللہ مالک ہے۔

آپ اپنی آمدن مجھ سے چھپا کر رکھتے ہیں ــــــ؟

نہیں بی بی میں نے کبھی کچھ نہیں چھپایا۔ پہلے بھی کہا تھا، لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کرو۔ اب تو ہاتھ تنگ ہونے لگا ہے۔

ایک دوست کے ساتھ آپ نے جو اسی ہزار روپے کی رقم کاروبار میں لگا رکھی تھی، وہ کیوں نکلوا رہے ہیں؟

قرض بہت چڑھ گیا ہے۔

قرض اور آپ پر ــــــ؟

بی بی ــــــ تم نے دیکھا نہیں، ٹریکٹر کا، ٹرالی، ہل، بلیڈ، تھریشر

رقم کہاں گئی ــــــ؟

تمھاری ضد کی بھینٹ چڑھ گئی۔ تمہارا اصرار تھا کہ بیٹیوں کا جہیز کسی پہلو سے کم نہ ہو۔

اس کی ماں کو یقین تھا کہ تمام مسائل کے باوجود یقینا کچھ نہ کچھ تو پس انداز ہوگا اور یقین نہ

کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ آخراتنے بہت سے لوگوں کی باتوں میں کچھ نہ کچھ تو سچائی ہوگی۔ گھر میں کسی چیز کی کمی تو نہیں۔ اس کی ماں نے سوچا، یہ مجھ سے چھپا رہے ہیں۔

اچانک ایک صبح قیامت گزر گئی۔ خون پیتی شاہراہوں پر اس کے ابوا یکسیڈنٹ میں اپنی جان ہار گئے۔

پھر وہی نسل در نسل مسائل کا سلسلہ۔۔۔۔۔ معاشی تنگی۔۔۔۔۔ قرض۔۔۔۔۔ تفکرات۔۔۔۔۔ الجھنیں۔۔۔۔۔ سوچیں۔۔۔۔۔!

گھر میں بچوں کی طرح ابو کی لکڑی کی الماری اور چمڑے کا خاکستری بکس بھی تنہا رہ گئے۔ وہی بکس جس میں کبھی چار سے پانچ جوڑے نہ ہوئے۔

ابو کی الماری ہمیشہ مقفل رہتی تھی۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا اس میں کیا ہے۔۔۔۔۔؟ ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانے کے لیے شناختی کارڈ کی ضرورت پڑی تو اس کی ماں نے زندگی میں پہلی بار مقفل الماری کو کھولا۔

الماری میں کیا تھا۔۔۔۔۔؟

حساب کتاب کی ڈائرایاں، زمینوں کے بہی کھاتے، عطر، پرفیوم، پالش، برش، ٹریکٹر کی مرمت کے اوزار، پلاس، رینچ، چابیاں، پانے، ٹریکٹر کی بیٹری چارج کرنے والا آلہ، جوارشِ جالینوس، قراقلی ٹوپی، ڈبل بیرل بندوق، خاندانی خطوط، تصاویر اور کبھی اداسی اور مایوسی در آنے پر ڈائری میں لکھے چند اشعار۔۔۔۔۔ سٹیمپ پیڈ، مہر اور۔۔۔۔۔ تین بینکوں کی کیش بکس

۔۔۔۔۔

شناختی کارڈ اٹھا کر الماری پھر مقفل کر دی گئی۔

بہت سے دن گزر گئے، گھر میں مالی مسائل ابھرنے لگے۔ ماں نے بیٹے کی پریشانیاں دیکھ کر ایک دن اسے اپنے پاس بلایا، پیار کیا، سمجھایا اور کہا۔

بیٹا۔۔۔۔۔ تمہارے ابو بہت زیرک اور دانا انسان تھے۔ ایک نہیں تین بینکوں میں ان کا اکاؤنٹ ہے۔ یہ لو اکاؤنٹ نمبر اور جا کر بیلنس معلوم کر آؤ۔

بیٹے نے ماں کی تسلی آمیز گفتگو اور چیک بکس دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا اور بینک کی راہ

لی۔

تینوں بینکوں کی بیلنس شیٹ لے کر وہ گھر پہنچا۔اس کی ماں منتظر تھی۔

بیٹا۔۔۔۔۔کتنی رقم ہے بینکوں میں۔۔۔۔۔؟

بیٹے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ماں۔۔۔۔۔ایک سوا کیاون روپے۔۔۔۔۔!

انتظار کرو

بارہ رُکنی کمیٹی تشکیل دے دی گئی۔۔۔۔۔

یہ کوئی قومی، صوبائی یا ضلعی کمیٹی نہیں تھی بلکہ ایک پس ماندہ شہر کے چند افراد سر جوڑ کر بیٹھے۔ انھوں نے روبہ زوال صورت حال کا عمیق نظروں سے جائزہ لیا۔ اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کی کہ کپڑے کی کھڈیاں کیوں بند پڑی ہیں۔ سرسوں کا تیل نکالنے والا کولہو جو بیل کی بجائے اب بجلی سے چلتا ہے کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ بازار میں خریداروں کی تعداد کم ہونے کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ گاہک کم ہونے کے باوجود دکان داروں کا معیارِ زندگی پہلے دن کی طرح کیوں بلند ہے؟ بازار میں تاجروں کے چیئرمین کی دکان میں سپلٹ ٹائپ ایئر کنڈیشن لگا ہے، جب کہ سبزی فروش کی دکان جس کی دیواریں چار بانسوں اور چھت پھٹے ہوئے کپڑے کی ہے۔ بازار میں گندگی کے ڈھیر لگے ہیں۔ پسِ دیوار کون ہے جو یہ کھیل کھیل رہا ہے۔ اگر آج ہم نے احتساب نہ کیا تو کل کو شہر کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ جنگل کا قانون ہو جائے گا اور یہاں شیر دھاڑتے پھریں گے۔ یہ ہمارا چھوٹا سا شہر ہے، ہم اتنا تو کر سکتے ہیں، ملکی سطح پر نہ سہی، نچلی سطح پر چند دیانت دار افراد کا چناؤ کر کے اپنے شہر کی قسمت بدل ڈالیں۔ شاید اس طرح شہر سے شہر تک بہتری کی صورت سے حالات بہتر ہو جائیں۔

بارہ رُکنی کمیٹی تشکیل دے دی گئی۔۔۔۔۔

کمیٹی کے چناؤ میں پوری احتیاط برتی گئی۔ ہر ممبر کا کردار جانچا اور پرکھا گیا۔ تاکہ ان میں کوئی بدکردار اور عیبی نہ ہو۔ ایجنڈے میں ترجیحات جو سرِ فہرست رکھی گئیں، کہ بازار سے سارا کوڑا کرکٹ اس طرح صاف کیا جائے جیسے تاجروں کے چیئرمین کا دفتر صاف اور شفاف ہے۔ قیمتوں کے کنٹرول کے لیے تین افراد کی ایک الگ کمیٹی بنائی گئی جس کا کام کام روزانہ بازار کا سروے کرنا اور آنے والے گاہکوں سے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ اشیاء کن نرخوں پر خرید رہے ہیں؟ بیوہ عورتوں کے لیے سلائی مشینوں کی خریداری تاکہ بازار میں بیٹھا درزی سلائی میں من مانی نہ کر سکے۔ سبزی اور گوشت کے کھوکوں کی بجائے ان کے لیے پختہ دکانوں کی تعمیر، بے روزگار نوجوانوں کے لیے ایک الگ شعبہ تشکیل دیا گیا تاکہ انھیں آسان قسطوں پر بلاسود قرضہ جاری کیا جائے تاکہ کرپشن کا خاتمہ ہو۔۔۔۔۔ تھانے کے ساتھ سمجھوتہ طے پانا کہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دے لیکن بے گناہوں کو تحفظ فراہم کرے تاکہ خوف کی فضا جنم نہ لے۔

کمیٹی کے ممبران نے اپنے اپنے فرائض سنبھال لیے۔ شہر کے غریب لوگوں کے گھروں میں امید کے چراغ جلنے لگے کہ چلو نچلی سطح پر ہمارے اپنے ممبران ہیں۔ ہم انھیں گریبان سے پکڑ سکتے ہیں۔ ان کے گھر ہمارے گھروں کے درمیان ہیں۔ حالاں کہ قومی اور صوبائی اسمبلی کے ممبران کے گھر بھی ہمارے گھروں کے درمیان تھے لیکن ان کی دیواریں بہت اونچی تھیں۔ ان کے گھروں کے باہر کلاشنکوف بردار اور السیشن کتے تھے۔ وہ اپنے گھروں سے بلٹ پروف گاڑیوں میں نکلتے تھے۔ ان کی ملاقات عوام سے صرف الیکشن کے دنوں میں ہوتی تھی۔ باقی وقت وہ اونچی دیواروں میں گھرے اپنے شیشے کے محلات میں گزارتے جہاں انھوں نے اپنے تعیش کے لیے انواع واقسام کے شغل پال رکھے تھے۔ باغات، باغات میں لہوولعب کی محفلیں، گھوڑے، مور، ہرن، پختہ سڑکیں، نہریں، تمام تر جدید آسائشیں، جدید ماڈل کی کاریں، انھیں گھوڑے رکھنے اور کاریں پالنے کا شوق تھا۔ ہیلی کاپٹر اور نجی جہازوں کے بعد وہ لوگ اپالو رکھنے کا سوچ رہے تھے۔ کیوں کہ سب کچھ چار دیواری کے اندر تھا۔ باہر کی دنیا ان کے لیے چاند کی طرح ویرانے کی مانند تھی۔۔۔۔۔

لیکن یہ کمیٹی تو اپنے شہر کی ہے۔۔۔۔۔

ایک سال بعد کمیٹی کا سالانہ اجلاس ہوا۔ تمام ممبران سال بھر کی کارکردگی کا جائزہ لینے کو

اکٹھے ہوئے۔ انھیں دیکھنا تھا کہ ان کی محنت کیا رنگ لائی ہے۔۔۔۔۔ مجموعی صورت حال انتہائی پریشان کن تھی۔۔۔۔۔

بازار میں گندگی کے ڈھیر بڑھ گئے تھے۔ سبزی اور گوشت کے تھڑوں کے آگے مکھیوں کے ساتھ ساتھ کتوں اور بلیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تاجروں کا چیئر مین جوں کا توں کرّ وفر کے ساتھ ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھا تھا۔ نرخ نامہ دیمک چاٹ گئی تھی اور نرخ آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ خودکشی کا تناسب بڑھنے سے بیوہ عورتوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ چور اُچکے دکان داروں سے بھتہ وصول کرنے لگے تھے۔ وہ گن پوائنٹ پر دکان داروں کا لاکر خالی کر کے لے جاتے، ڈاکٹروں نے فیس، بلڈ ٹیسٹ، یورین ٹیسٹ، الٹرا ساؤنڈ، سی ٹی سکین اور اینڈوسکوپی جیسے ٹیسٹوں کی فیس اس حد تک بڑھا دی تھی کہ مریض آرام سے گھر پر ہی اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دیں۔ مریض میڈیکل سٹور میں رکھی ادویہ کو نوادرات کی طرح دیکھتے ہوئے گزر جاتے۔ تعلیم صرف امراء تک محدود ہو کر رہ گئی۔ غریبوں کے بچے دن بھر گلی ڈنڈا کھیلتے اور ماں باپ کی جھڑکیاں سنتے۔

بارہ ممبران سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔۔۔۔۔

اس کمیٹی کا فائدہ ہی کیا۔۔۔۔۔ کیا رزلٹ نکلا ہے؟

سر۔۔۔۔۔ ہم نے اپنے طور پر پوری کوشش کی۔۔۔۔۔ ایک ممبر نے کمیٹی چیئر مین سے کہا۔

کیا کوشش کی۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں کیا گیا۔۔۔۔۔ تمھارے گھر سبزی اور گوشت مفت پہنچتا رہا۔ تم نے کیا کرنا تھا۔۔۔۔۔؟

سر۔۔۔۔۔ بات یہ ہے۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔!

چُپ رہو۔

اور تم۔۔۔۔۔ چیئر مین نے دوسرے ممبر کی طرف دیکھا۔ تمھارے بیٹے نے اجلے کپڑے پہن لیے اور نئے ماڈل کے موٹر سائیکل پر اب کالج جاتا ہے۔ جب کہ پچھلے سال اس کے پاس جو سائیکل تھی وہ ویلڈنگ کے سہارے چلتی تھی۔

اور تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تیسرے ممبر کو دیکھتے ہوئے چیئر مین کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔

تمھاری بیوی نے سلائی سنٹر کھول لیا ہے۔

اجلاس میں سناٹا چھایا تھا۔۔۔۔۔بس وہی ایک بول رہا تھا۔۔۔۔۔

تمھیں معلوم ہے تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔اس نے چوتھے ممبر کی طرف قہر آلود آنکھوں سے دیکھا

جو قرضہ بے روزگار نوجوانوں کو دیا جانا تھا، اس سے تم نے پلاٹ خرید کر کوٹھی تعمیر کرڈالی۔ خودکشی کی شرح میں اضافہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا، عورتیں بیوہ نہ ہوتیں تو اور کیا ہوتا؟

جس کے سپرد اقتدار کیا جائے۔۔۔۔۔وہ اپنا گھر بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ الزام ہم باہر والوں پر دھرتے ہیں۔ حالاں کہ اپنے شہر کو ہم نے خود دیمک کی طرح چاٹ کھایا ہے۔

سر۔۔۔۔۔اگر گستاخی نہ ہو تو ایک تجویز ہے۔۔۔۔۔ایک ممبر بولا۔

کہو۔۔۔۔۔!

سر۔۔۔۔۔آپ ایک سہ رکنی کمیٹی تشکیل دیجیے جو اس بات کا جائزہ لے کہ کمیٹی کے ممبران نے ایسا کیوں کیا۔۔۔۔۔؟

بالکل سر۔۔۔۔۔کڑا احتساب ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ایک اور ممبر نے ہم نوائی کی۔

سر۔۔۔۔۔احتساب کے لیے آپ باہر سے آدمی سے لیں۔۔۔۔۔

اچانک چیئر مین ہنسا۔۔۔۔۔

میرے بھائیو۔۔۔۔۔مجھے تو یوں لگ رہا ہے میں اس کمیٹی کا نہیں ملک کا سربراہ ہوں۔ سارے فیصلے مجھ ہی کو چکانے ہیں۔۔۔۔۔

سر۔۔۔۔۔کوئی راستہ۔۔۔۔۔؟

شہر کے عوام کو یوں بے یارومددگار تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔

پہلے اس کمیٹی نے کون سی کارکردگی دکھائی ہے جو اب ایک اور کمیٹی تشکیل دی جائے۔۔۔۔۔

ہر کمیٹی کا حتمی رزلٹ یہی نکلتا ہے۔۔۔۔۔

لیکن سر، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔۔۔۔۔نا۔۔۔۔۔

اگر میں یک رکنی کمیٹی تشکیل دے کر فیصلہ سنادوں تو بلا چون وچرا مان لو گے۔۔۔۔۔

سر بالکل مان لیں گے۔۔۔۔۔

سب اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور گہری نیند سو جاؤ۔۔۔۔۔

اور۔۔۔۔۔سر۔۔۔۔۔پھر۔۔۔۔۔ہمیں بیدار کون کرے گا۔۔۔۔۔؟

صورِ اسرافیل کا انتظار کرو۔

لوٹایا ہوا سوال

تسبیح خانے کے سامنے چمکیلی جوتیاں اتار کر وہ اندر داخل ہوا۔ ایک لمبا سانس لیا۔ پنکھا تیز کرنے کو کہا اور باتھ روم کے چپل پاؤں میں اڑس کر تولیہ کندھے پر ڈالا۔ باقی سب مہمان تسبیح خانے میں دوزانو مؤدب بیٹھے تھے۔ ماحول میں تقدس اور پاکیزگی کی خوشبو تھی، بھینی بھینی سی۔ مہمانوں کی جدید ماڈل کی کاریں باہر کھڑی تھیں۔ ڈرائیور قبرستان کی مغربی سمت سمبل کے درختوں کے درمیان سگریٹ سلگائے گپیں ہانک رہے تھے۔ تسبیح خانے، مہمان خانے، کتب خانے اور مسجد کے قریب سگریٹ پینے کی ممانعت تو نہیں تھی، لیکن ادب اور احترام کی وجہ سے یہاں کوئی سگریٹ پینے کی گستاخی نہیں کرتا تھا۔ کہتے ہیں، ایک بار کوئی یہ جسارت کر بیٹھا تھا اور اقتدار سے محروم ہو گیا۔ مہمانوں کی توقیر خانقاہ کے مکینوں کی گھٹی میں تھی۔

تسبیح خانہ ایک ایسا متبرک کمرہ تھا، جو صدیوں سے بزرگوں کی تسبیحات کا امین تھا۔ ایک کرنل جو اپنے باطنی آشوب سے پناہ کے لئے آ مقیم ہوا۔ خواب میں سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں کی زیارت کی۔ پھر وہ جب بھی آیا، بوریا نشینوں کے قدموں میں بیٹھ کر دُرِ نایاب پائے۔ ترقی کی

وہ منازل سیاہ بالوں کے ساتھ طے کیں کہ کنپٹیاں سفید ہونے پر بھی بدقت نصیب ہوتی ہیں۔ایک بریگیڈئیر نے جب اپنے ڈرائیور کو ننگے فرش پر بیٹھ کر ساتھ کھانا کھانے کو کہا تو اس نے جھجک کر کہا۔

سر..... میں.....؟

بیٹھ جاؤ، یہاں محمود وایاز ایک ہی صف میں ہوتے ہیں۔

عصر کا وقت تھا کہ وہ بزرگ جن کی وجہ سے پورا ماحول تقدس کے ہالے میں تھا، اپنے زانو پر ہاتھ رکھ کر اٹھے اور سیدھی کمر کھڑے ہو گئے۔ دودھ جیسی داڑھی پر ہولے سے ہاتھ پھیرا، جیسے اسے سہلا رہے ہوں اور چائے کے لئے گھر تشریف لے گئے۔ مہمانوں میں بھنبھناہٹ ہونے لگی۔ باتوں کے لچھے کھل گئے۔

وہ تسبیح خانے ساتھ متصل غسل خانے سے نکل کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔اس کے چہرے پر سیاہ گھنی داڑھی، بوسکی کا کرتا اور شلوار کے پائچوں پر مچھلی کنڈا اکڑھائی تھی۔اس نے اپنی جیب سے رومال نکالا۔آمنے سامنے کے دونوں کونے باہم ملائے اور اس مثلث کو ماتھے پر رکھ کر سر کے پیچھے گرہ لگادی۔

آیئے، میں آپ کو اپنے رشتہ داروں سے متعارف کراؤں۔ ایک درویش دسترخوان پر پیالیاں چن رہا تھا۔

ان سے ملئے، میرے سگے ماموں، ممبر قومی اسمبلی ہیں۔ بہت نفیس طبیعت پائی ہے۔آپ رشوت کو سؤر کے گوشت کی طرح حرام سمجھتے ہیں۔اس فقرے پر ممبر کے چہرے پر ایک لہر آئی اور پیشانی کی سلوٹوں میں ایک اور کا اضافہ کرتی گئی۔ میرے ماموں کا دل گداز ہے۔ڈیرے پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ان کے چہرے پر کبھی سلوٹ نہیں آئی۔

ممبر نے جیب سے اعلیٰ تمبا کو کی زرد ڈبیا نکالی۔ میں کانپ گیا کہیں اقتدار غروب ہونے کا وقت تو نہیں آ گیا، لیکن اس نے ڈبیا اور پائپ جیب میں واپس رکھ لئے۔شاید رسی دراز تھی.....

اور..... ان سے ملئے، چیئرمین ضلع کونسل..... تایا ہیں میرے.....! علاقے میں کوئی سڑک کچی نہیں رہی۔ سڑکیں، پلیاں اور کھال ان کے ارادوں کی طرح پکے ہو گئے ہیں۔ یہ صلہ رحمی کی برکات ہیں۔اس کے تعارفی انداز میں عجیب سی عجلت تھی۔

ممبر قومی اسمبلی باہر نکل کر درویشوں سے باتیں کرنے لگے۔ مہمان تسبیح خانے میں

دیواروں پر آویزاں انبیاء اور صوفیاء کے شجرۂ نسب دیکھ رہے تھے۔ صدیاں ان کے سامنے متشکل تھیں اور وہ مجھے اپنے خاندان سے متعارف کرانے میں مگن تھا۔

آپ کو معلوم ہے کیا، ہمارے خاندان میں کیسے کیسے گوہر ہیں.....؟ ماموں اور تایا..... اب ان سے ملئے نا، میرے بہنوئی ایک بڑے ادارے کے چیئرمین، باذوق اور ادب کے شناور.....!

یہاں پر موجود رشتہ داروں سے تو آپ متعارف ہو گئے، کبھی ہمارے علاقے میں آیئے نا..... آپ حیران رہ جائیں گے ..... دو ماموں زاد مِل اونر ہیں اور بڑے بھائی ماہرِ امراضِ قلب..... اللہ اللہ، میرا خاندان..... میرا سلسلہ نسب..... داداجان کے گھوڑوں کا استھان، ایک سے ایک اعلیٰ نسل کا وہ ایرانی گھوڑا کہ جیسا پورے ملک میں اور کسی کے پاس نہیں۔ مشکی گھوڑی تو انہوں نے افریقہ سے منگوائی ہے۔ ان کی دیکھ بال کا الگ شعبہ ہے۔ باوردی خدمت گار، خوراک میں کئی کلو سیب، دودھ اور میوہ جات، سالانہ مقابلے میں دور دور تک ہمارے گھوڑوں کی دھوم ہوتی ہے۔ مجھے تو ان کی نسل اور نسب کا اتنا شوق ہوا کہ داداجان نے چند ماہ کے لئے بیرونِ ملک بھجوا دیا۔ مجھے علمِ ہندسہ سے بھی گہری لگن ہے۔ میں نے اپنے خاندان کا نسب نامہ تیار کیا ہے۔ بڑے بھائی نے مجھے نساب کے نام سے موسوم کیا ہے۔

وہ بلا تکان بول رہا تھا.....

اور میں اپنی ذات کی پہچان، اپنے انساب میں تلاش کر رہا تھا۔ حضرت آدمؑ سے لے کر خاتم الانبیاءﷺ تک ایک فریم میں ایسا شجرہ تھا جو شاخ در شاخ درخت کی صورت میں بنایا گیا تھا، صوفیاء کے تمام سلاسل کے شجرے آویزاں تھے۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ سے امیر المومنین حضرت علیؓ اور حضرت امام جعفر صادق سے جاری فیضان بایزید بسطامی سے ہوتا ہوا ابوالحسن خرقانی ابوعلی فارمدی، بابا محمد سماسی، یعقوب چرخی اور خواجہ ابوسعید کے میٹھے چشموں سے گزرتا موسیٰ زئی کے نخلستان میں دوست محمد قندھاری، عثمان دامانی اور خواجہ سراج الدین کی ٹھنڈی ہوائیں لے کر ابواسعد احمد خان کی اس خانقاہ کے تسبیح خانے میں تصوفانہ خوشبو سے معطر ماحول بے خود کئے دے رہا تھا۔ میں اسے بتانا چاہ رہا تھا کہ ہماری پہچان کیا ہے؟ ہم کون ہیں.....؟ ہمارے اجداد کون تھے.....؟ ہمارا سلسلۂ نسب ہست و بود سے پرے کائنات کے خالق سے جا ملتا ہے،

وہی اصل ہے، وہی کل..... !تم کیسے نساب ہو کہ گھوڑوں کے نسب نامے مرتّب کرتے پھر رہے ہو، تمہارے خاندان کی ناموری تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔ بقائے حیات اور سفرِ آخرت میں تمہارا خاندان تمہارے ساتھ شریکِ سفر نہیں ہوگا۔ اپنی ذات کے غارِ حرا میں اترو۔ شاید تم پر نفی اثبات کا راز کھل جائے۔ مقدر سے یہاں آگئے ہو تو اپنی ذات کا عرفان کیوں نہیں پا لیتے.....؟ یہ تسبیح خانہ نہیں، یہاں صدیاں دھڑکتی اور سانس لیتی ہیں، یہاں علم و آگہی کے عرفان کی ندیاں رواں ہیں۔ یہاں صرف قلوب ہی ذکر نہیں کرتے بلکہ پتا پتا، بوٹا بوٹا، اللہ اللہ کے ورد سے زندہ ہے۔ تخلیقِ کائنات سے پچاس ہزار سال پہلے اللہ نے روحوں سے سوال کیا تھا۔

السست بربکم؟

روحوں نے کہا

بلیٰ.....

یہ وہی تسلسل ہے۔ تسبیح خانہ تخلیقِ کائنات سے پچاس ہزار سال پہلے بھی موجود تھا، آج تم آئے ہو، کل کوئی اور آئے گا۔ اپنے آپ کو پہچان لو۔ اصحابِ صفہ کے چبوترے سے اس تسبیح خانے تک کائنات کا تسلسل ہے۔ یہ منزلیں روح کی بقاء کی علامت ہیں۔

لیکن وہ بولتا رہا۔

اس کی روح کے کواڑ پر ممبر قومی اسمبلی، چیئرمین ضلع کونسل اور دادا جان کے گھوڑوں کا پہرہ تھا۔

میرے چچا کئی سال سے فارن میں مقیم ہیں، ان کی دو بیویاں اور چار کوٹھیاں ہیں.....

میں اس کی گفتگو میں مخل ہوا۔

میری خواہش تھی، وہ اس در سے خالی نہ لوٹے۔

میرے بھائی، تم نساب ہو۔ تمہیں اپنے خاندان سے محبت ہے۔ کیا تمہارے علم میں ہے کہ عربوں میں کیسے کیسے نساب گزرے ہیں۔ ان کے حافظے قوی تھے۔ انہیں انساب وارحام ازبر تھے..... یہ شجرہ دیکھ رہے ہو.....؟

جی..... کتنا خوبصورت فریم ہے؟ نفیس، گولڈن، عمدہ..... لاجواب فریم ہے۔ کمرے کی بناوٹ بھی قدیم طرز کی ہے..... اجداد کی یادگار ہے نا..... کیسی اونچی چھت کی عمارتیں

بنایا کرتے تھے۔

باہر سے ہارن کی آواز سنائی دی ..... مثلث کھسک کر اوپر ہوگئی۔ اس نے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے چٹکی بنائی اور اوپر کھسک جانے والے رومال کے کونے کو کھینچ کر نیچے کیا۔

اچھا، ہم چلتے ہیں..... کبھی ہمارے ہاں آیئے نا..... ضرور آیئے..... تاکید ہے، بھول نہیں جانا.....

وہ چمکیلی جوتیاں پہن رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کے باطن کی ساری چمک تو انہی چمکیلی جوتیوں تلے کچلی جا رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا.....

بھائی..... آپ کے ماموں ممبر قومی اسمبلی ہیں۔ جناب آپ حکم کیجیئے..... کوئی کام ہے تو بتایئے نا..... کام یوں ہو جائے گا..... اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

کام نہیں ہے مجھے..... آپ کے ماموں ممبر قومی اسمبلی، تایا چیئرمین ضلع کونسل، ماموں زاد مل اونرز اور دادا جان کے گھوڑوں کا استھان، مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ آپ کی ذاتی شناخت کیا ہے؟ اور نسبت کس سے ہے.....؟

اور جب میں یہ پوچھ رہا تھا تو اپنے نسب کی آخری کڑی اندر ہی اندر گن چکا تھا.....

اس کا ایک پاؤں تسبیح خانے کے اندر اور دوسرا جوتی میں تھا۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا.....

اس کی پتلیاں ٹھہری ہوئی تھیں۔

ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے یوں محسوس ہو، میرا ہی سوال اس کی ٹھہری پتلیوں سے منعکس ہو کر میرے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔

وقت کی فصیل

رات کا کوئی پہر تھا۔

مجھے یاد نہیں۔ ساعتِ بے وقت کی آواز تھی شاید۔۔۔۔!

میرے دماغ کے خلیوں میں ماضی، حال اور مستقبل گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وقت اپنی حیثیت اور تعین کھو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ میرا ماضی کسی کا مستقبل رہا ہوگا اور کسی کا حال۔۔۔ اور میرا مستقبل کچھ روز بعد میرا اپنا ماضی بن جائے گا۔ میرا حال بھی میرا اپنا کہاں ہے۔؟ کتنی برق رفتاری سے یہ ماضی میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ لاشعور کے اندھے کنویں میں مدفون ماضی کو تلاش کرنا اتنا آسان بھی نہیں۔ یہ تو ایسا کنواں ہے جس میں سے کبھی کبھی اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی نہیں دیتی۔ تینوں زمانوں ماضی حال اور مستقبل کو میں نے ترتیب میں لانے کی اپنی سی کوشش کر دیکھی۔ لیکن وہ ہر بار بے ترتیب ہو گئے۔

میں زمان ومکان کی بھول بھلیوں اور وقت کے لامحدود پیمانوں کے پوشیدہ اسرار ورموز کی لاینحل گتھیوں کو سلجھانے کی الجھن میں گرفتار اپنے آپ سے برسرِ پیکار تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں وقت کے پیمانوں سے نکل کر دستک کی طرف متوجہ ہوا۔ زندگی میں انسان کو کوئی بھی دستک نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے ۔ ہر دستک اپنے بطون میں کوئی نہ کوئی پیغام رکھتی ہے۔

میں نے دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔

ناممکنات نے ممکنات کی سرحد پر دستک دی تھی۔

میرے اپنے ہی افسانے کا ایک کردار میرے سامنے کھڑا تھا۔نحیف ونزار، ہڈیوں کا پنجر، ریش سفید اور میلی، کُرتا ململ کا، شلوار لٹھے کی ، پاؤں میں بوسیدہ کھسہ ، چہرے پر جھریوں کا جال جیسے بہت سی ریلوے لائینیں ایک دوسرے کو قطع کر رہی ہوں۔

بابا عزیز۔۔۔۔تم۔۔۔۔؟ میں نے اس کا استخوانی ہاتھ تھام کر پوچھا۔

ہاں۔۔۔یہ میں ہوں بیٹا۔

بابا تمہیں تو کہولت نے آلیا ہے۔

ہاں بیٹا۔۔۔۔

اب اپنی دھرتی پر بھی اولڈ ہاؤس کا کینسر پھیل گیا ہے۔میں نے اولڈ ہاؤس کی بجائے تمہارے افسانے کے جنگل میں ہی بسیرا کرنا پسند کیا۔تم نے تو پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔افسانے کے سارے کردار ایک ایک کر کے کہیں نقل مکانی کر گئے اور میں تنہا رہ گیا۔

افسانے کے جنگل سے راستہ کھوج کر میرے گھر تک کیسے آئے۔۔۔۔؟

بیٹا۔۔۔افسانوں، ناولوں اور کہانیوں کے کردار بھی انسانوں کی مانند ہوتے ہیں۔سانس لینے کے عمل سے گزرتے اور زندہ رہتے ہیں ۔ ہمارا بھی مل بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔تنہائی ہمیں بھی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔میرا جی اداس ہوا۔ میں تمہاری تخلیق کا ایک کردار ہوں۔سوچا سانس کی ڈوری ٹوٹنے سے پہلے تم سے مل آؤں۔

بابا عزیز رات گئے میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔۔۔۔؟

میں خدمت کے لئے نہیں آیا۔ مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے افسانے ”ہے کوئی“ کے کردار کی طرح امر کر دو۔

میں نے اسے صوفے پر بٹھایا۔ سردی سے کپکپاتی ٹانگوں پر کمبل ڈالا۔ الیکٹرک کیٹل آن کی۔ ٹیلیویژن آن کرنے لگا تو بابا عزیز کھڑا ہو گیا، اپنے پورے قد کے ساتھ۔!

ٹیلیویژن بند ہی رہنے دو بیٹا۔۔۔ اس نے اشکبار آنکھوں سے کہا۔

بابا۔۔۔ تازہ خبریں تو سن لیں۔۔۔ خبرنامے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔

اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔ اسے آن نہ کرو۔ خبرناموں سے مسلمانوں کا لہو رستا ہے۔ عالمی طاقتوں کی تھوتھنیوں سے رستا لہو مجھے پاگل کر دیتا ہے۔۔۔ دہشت گرد مغربی طاقتیں۔۔۔! بابا عزیز نے نفرت سے تھوکتے ہوئے کہا۔۔۔ ان کی تھوتھنیوں کو مسلمانوں کے خون کی چاٹ لگ گئی ہے۔

الیکٹرک کیٹل میں پانی ابل رہا تھا۔ ٹیلیویژن بند تھا۔ الماری سے دو مگ نکال کر میں نے میز پر سجائے۔ کافی اور ڈرائی ملک ڈال کر جب پانی انڈیلا تو وہ لہو سے بھر گئے۔ خوف زدہ آنکھوں سے میں نے اپنے افسانے کے کردار کی جانب دیکھا۔ وہ صوفے پر دراز تھا۔۔۔ پرسکون اور خاموش۔

بیٹا۔۔۔ یہ ہمارا اپنا لہو ہے۔ تم گھبرا کیوں گئے۔ دیکھو تو۔۔۔ ذرا غور سے۔۔۔ اپنے گھر کی دیواروں کو۔۔۔ بازاروں اور شہروں کو۔۔۔ تمہیں لہو کے چھینٹے نظر آئیں گے۔ میری خواہش ہے کہ اب تم لہو کی تحریریں پڑھنا سیکھ ہی لو تو بہتر ہے۔ ہمیں ان تحریروں کا جواب لکھنا ہے۔

مجھے اپنے افسانے کے کردار نے خائف کر دیا۔ اسے لوٹ جانا چاہیے۔ یہ کون سی تحریر کی بات لے بیٹھا ہے۔ ان تحریروں کو سمجھنے اور ان کا ادراک رکھنے والوں کا وجود ہی عنقا ہو گیا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کا انتظار عبث ہے۔ آج تو سارے مظلوم ممالک ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہے ہیں سب خائف ہیں کسی کو نہیں معلوم یہ پتلی تماشا کیا ہے۔۔۔؟ پردے کے پیچھے کون ڈور سنبھالے ان پتلیوں کو نچا رہا ہے۔ سب تماشائی ہیں۔ جنگی جہاز پرندوں کی مانند فضا میں منڈلاتے رہتے ہیں۔ لیکن پرندے بم تو نہیں برساتے۔۔۔ نا"

صوفے سے اتر کر بابا عزیز آتش دان کے پاس آ بیٹھا۔

مگ خون سے لبریز تھے۔ ٹیلیویژن بند تھا۔

بابا عزیز۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔؟

ہم اتنے سہمے ہوئے اور خوف زدہ کیوں ہیں۔۔۔۔۔؟ شجاعت اور خودداری جو ہماری میراث تھی وہ کیا ہوئی؟ حکمرانوں کے دل میں بزدلی کیوں ڈیرا ڈالے بیٹھی ہے۔۔۔؟ ہمارے قلوب سے خوفِ خدا نکل گیا ہے۔ آسائشات نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ ہم نے تن آسانی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ وہ دنیا جس کی حیثیت ربِ کریم کی نظروں میں مکھی کے پر کے برابر نہیں تھی۔ ہم اسی غلاظت کی دلدل میں دھنس گئے ہیں۔ اسی لئے دشمنوں کے قلوب سے ہمارا رعب جاتا رہا۔ وہ بلا تکان بول رہا تھا۔ آتش دان میں شعلے تھے۔

پہلے پہل بیٹا۔۔۔۔ گھر اور بستی کے دکھ ہوتے تھے۔ اور اب۔۔۔۔۔؟ اب تو دنیا سمٹ گئی ہے۔۔ میڈیا نے تو ہم کو ہمارے اپنے دکھ بھی بھلا دئے۔

وہ کیسے۔۔۔۔؟

روزانہ ہم جو دیکھتے اور سنتے ہیں۔ وہ ہمارے شعور اور لاشعور میں اودھم مچاتا رہتا ہے۔ وہی تصویریں متحرک رہتی ہیں۔ رملہ کی گلیوں میں اسرائیلی ٹینک معصوم فلسطینی بچوں کو کچل دیتے ہیں۔ سارے شہر کھنڈر بنتے جا رہے ہیں۔ کابل، قندوس، قندھار اور تورا بورا پر دیو ہیکل جنگی جہاز لاکھوں ٹن بارود برسا چکے ہیں۔ دہشت گرد مغربی طاقتیں۔۔۔ ان کی تھوتھنیوں سے رستا لہو۔۔۔۔! میری خواہش تھی میرے افسانے کا کردار چلا جائے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا

۔۔۔۔

بابا بہت رات ہوگئی!''

چلا جاؤں گا بیٹا۔ لیکن تمہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ میں نے یہ پر صعوبت سفر کیوں طے کیا

؟''

میرے لئے انہماک سے اس کی باتیں سننا مشکل تھا۔ میں نے بی بی سی ٹیلیویژن پر ایک فیشن شو دیکھنا تھا۔ ایم ٹی ٹیلیویژن اور زی ٹیلیویژن پر گانوں سے لطف اندوز ہونا تھا۔ اولمپک گیمز کی جھلکیاں بھی دیکھنی تھیں اور میرے افسانے کا کردار جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ جانے اس نے کیسے میری قلبی کیفیات کو بھانپ لیا۔

وہ ہنسا۔۔۔۔۔ زہر خند۔۔۔۔۔ اور کہا اپنے اپنے کھیل ہیں۔ تم اس لیے بیزار نظر آ رہے ہو کہ تم کو ٹیلیویژن کے ہیجان انگیز پروگرام اپنی طرف بلا رہے ہیں اور تمہاری خواہش ہے کہ میں

جلد سے جلد لوٹ جاؤں تاکہ تم ان پروگراموں سے لطف اندوز ہوسکو۔ یہ تمہارا کھیل ہے۔ تم کو یہی کھیلنا ہے۔ زندگی میں عیش تلاشنا ہے اور۔۔۔ وہ۔۔۔ لہو کا کھیل کھیلنے والے۔۔۔۔ وائے افسوس۔۔۔۔!

مجھے نیند آرہی ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے بہانہ تراشا۔

بیٹا۔۔۔ چلتا ہوں میں۔ اکتا کیوں گئے۔

ایک بار گھر کے دیوار و در تو دیکھ لو۔ ہر طرف لہو کے چھینٹے تھے۔ مگ بھی لہو سے لبریز۔۔۔ الیکٹرک کیٹل، فرنیچر اور فرش پر بھی رنگ بدل چکے تھے۔ اپنے کپڑوں کی طرف نظر کی تو شرٹ بھی آگ پکڑ چکی تھی۔

بابا عزیز عصا کے سہارے کھڑا ہوا۔ اور شعلہ بار آنکھوں سے گویا ہوا۔ نوکِ قلم کی بجائے نوکِ تلوار سے اس تحریر کا جواب نا لکھا گیا تو ہمارا وجود دنیا سے نیست و نابود ہو جائے گا۔ میں اس جھنجھٹ سے باہر آنا چاہتا تھا۔

بزرگی کے تقدس کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے کہا۔

رات بہت ہوگئی بابا۔۔۔۔

آخرِ کار وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ اداس ملول اور غمزدہ میں اسے دروازے تک چھوڑنے گیا۔

پلٹ کر میں کمرے میں آیا تو زمانے بدل چکے تھے۔ جیسے ایک پل گزرا۔

مگ دو تھے لیکن کافی سے لبریز۔۔۔ شرٹ پر شعلے سرد ہو چکے تھے۔ دیوار و در بھی بے تحریر تھے۔ میں تحیر زدہ۔۔۔ خوف کی چادر کندھوں سے سرکتی ہوئی۔ کافی کا گرما گرم کپ ہاتھ میں پکڑے میں نے ٹیلیویژن آن کیا۔ سی این این خبریں اگل رہا تھا۔ ارضِ فلسطین کا کربناک منظر سامنے تھا۔

یاسر عرفات اسرائیل کی طرف سے محاصرہ اٹھائے جانے کے بعد عوام میں گھرا بازو لہرا لہرا کر پرجوش انداز میں اپنا نقطۂ نظر بیان کر رہا تھا۔ میں نے چینل بدل دیا۔

اور فیشن شو میں شامل خوبرو اور لچک دار لڑکیوں کے جسم کے بولتے زاویوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔

مسافر تو گیا

کوئی ہے۔۔۔۔۔؟

آواز تو دو۔۔۔۔۔

بھائی عبدالحمید۔۔۔۔۔

اے بھائی عبدالحمید۔۔۔۔۔ میرے بھائی۔۔۔۔۔

دروازے کا پٹ کھلا رہنے دو۔ میرا بھائی آرہا ہے، دیکھو سامنے شیشم تلے وہ بیٹھا وضو کر رہا ہے۔ میں کہتا نہ تھا میرا ماں جایا ضرور آئے گا۔

حکیم جی، سردی شدید ہے، دروازہ بند کر لینے دیں۔ مؤذن بابا عزیز نے کہا۔ عزیز بابا ۔۔۔۔۔ دروازہ مت بھیڑ ۔۔۔۔۔ کھلا رہنے دے ۔۔۔۔۔ دروازے بند نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ بند ہو جائیں تو گھروں میں چڑیلیں بسیرا کر لیتی ہیں۔ بند دروازوں کے پیچھے جانے

کیاہوتا رہتا ہے۔۔۔۔۔؟ مجھے خوف آتا ہے بند دروازوں سے۔۔۔۔۔عبدالحمید جب آخری بار حویلی سے نکلا تھا تو دروازہ بند کر کے گیا تھا۔ میں اسی بند دروازے کا عذاب بوڑھی آنکھوں کی دہلیز پہ رکھے جی رہا ہوں۔ کاش دروازے کی طرح میری آنکھیں بھی بند ہو جائیں۔ بند آنکھوں کو کون کھولنے آئے گا۔ کوئی نہیں، میں جی لوں گا۔۔۔۔۔ میں مر بھی گیا تو شاید عبدالحمید کے انتظار میں یہ آنکھیں کھلی رہیں۔ حویلی کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ یہ آنکھیں تو کھلی رہیں، عزیز بابا دروازہ کھلا رہنے دے۔۔۔۔۔

حکیم عبدالرحمٰن کی حالت دن بہ دن بگڑتی جا رہی تھی۔ ضعیفی اور جوڑوں کے درد نے اسے چارپائی کا اسیر کر دیا تھا۔ دن بھر طویل برآمدے میں بوسیدہ چارپائی پر بیٹھے وہ خلا میں گھورتے رہتے۔ تکئے پر ماتھا ٹیک کر نماز ادا کر لیتے۔ قوت سماعت متاثر ہونے سے وہ اونچا سننے لگے۔ ساٹھ سالہ سفید ریش عزیز بابا نے مسجد کے پہلو سے ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر چولہا بنایا۔ لکڑیاں چن کر آگ جلائی اور حکیم جی کے لیے دلیہ بنانے لگا۔ حکیم جی چارپائی پر بیٹھے بڑبڑاتے رہے۔

انوش دارو۔۔۔۔۔ اچھا انوش دارو اس سے معدہ درست رہے گا۔۔۔۔۔ سفوف راحت کی پڑیا بھی معدے کے لیے اکسیر ہے۔۔۔۔۔ سیاہ لمبے گھنے بال۔۔۔۔۔ گیلے۔۔۔۔۔ بارش کی بوندیں گر رہی ہیں۔۔۔۔۔ سفوف جواہر پانچ سو روپے تولہ ہے، میرا کیا قصور ہے۔ عنبر اور کستوری خالص ڈالی ہیں۔ اجزاء مہنگے ہیں۔۔۔۔۔ وہ زلفیں تھیں کہ شب دیجور۔۔۔۔۔ جوارش جالینوس تو طب میں صدیوں سے رائج ہے۔۔۔۔۔ میں نے زکام کے لیے ایسا نسخہ تجویز کیا ہے، بس نہ پوچھیں۔۔۔۔۔ سونف کا بھنبھل، اسے سستا اور معمولی جان کر چھوڑنا نہیں۔۔۔۔۔ اس میں خشخاش بھی ہے۔۔۔۔۔ ایک اور نسخہ ہے زکام کا۔۔۔۔۔ آدھ کلو بکری کا گوشت۔۔۔۔۔ اس میں بیس بادام، چھوٹی الائچی، خشخاش اور تھوڑا زعفران ڈال کر بھون لیں۔ سردیوں میں زکام کے لیے تیر بہدف ہے۔۔۔۔۔ ہائے میری طب کی کتابیں۔۔۔۔۔!

حکیم جی۔۔۔۔۔ چپ رہیئے، دلیہ بن رہا ہے۔

آگ بجھنے لگی تو عزیز بابا نے اور لکڑیاں چن کر آگ جلائی۔ گیلی لکڑیوں کے سلگنے سے دھواں دلیے میں شامل ہوتا رہا۔ حکیم جی نے جیسے ہی دلیے کا پہلا چمچہ منہ میں ڈالا۔۔۔۔۔ منہ بنا

کر بولے، اخ تھو ------ یہ دلیہ ہے ------ عزیز بابا تم نے دھواں پکایا ہے کہ دلیہ ------؟ نہیں کھانا تو نہ سہی، یہ رہی لنگر کی دال اور روٹی ------ عزیز بابا نے دلیے کی پلیٹ اٹھائی۔ مرچ زیادہ ہے دال میں اور میں معدے کا مریض ہوں۔

حکیم جی یہاں آپ کا کون بیٹھا ہے؟ صبر شکر کیا کریں ------ جو مل جائے کھالیا کریں۔

عزیز بابا ------ میرا ایک کام کرو گے ------؟

کیا کام ہے ------؟

پیر جی سے کہو، میری عمر جا رہی ہے۔ ہم مسافر ہیں مسافر ------ گھڑی بھر کے مہمان۔

پیر جی سفر میں ہیں، سوموار کو لوٹیں گے۔

ساری دنیا سفر میں ہے۔ سب چلے جائیں گے ------ کوئی نہیں رہے گا۔ ایک دن یہ کائنات بھی نہیں رہے گی ------ یہ مسافر بھی چلا جائے گا۔

کون مسافر ------؟

میں مسافر ------ عبدالرحمٰن ------ جس کی روح میں آبلے ہی آبلے ہیں۔ میرے اندر ماضی کا ناسور پل رہا ہے۔ اندر سے گل سڑ گیا ہوں میں۔ میرے وجود سے لوگوں کو گھن کیوں نہیں آتی۔ شاید مجھے روح نے ڈھانپ رکھا ہے۔ نہیں رہے گی تو مجھے اٹھا کر گڑھے میں ڈال آئیں گے۔ پیوندِ خاک ہو جاؤں گا۔ میں چلا گیا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ساری کائنات کا نظام اسی طرح رواں دواں رہے گا۔ کسی ایک کے مرجانے سے کچھ بھی تو نہیں بدلتا۔ عزیز بابا خاموشی سے حکیم جی کی باتیں سنتا رہا ------ وہ ان کا مزاج شناس ہو گیا تھا۔ پیر جی سفر سے لوٹے تو حکیم جی نے ان سے کہا، میری عمر جا رہی ہے، میں کوئی دم کا مہمان ہوں، کتنا نادان تھا میں، سو برس کا سامان کیا اور پل کی خبر نہ تھی۔ مرنے سے پہلے اس زمین پر ایک سرائے، ایک چھت بنا جاؤں، شاید میرا رب مجھے وہاں عرش کا سایہ نصیب کر دے۔ پیر جی میرے پاس نوے ہزار روپیہ ہے۔ میری کل پونجی آپ لے لیجئے اور درویشوں کی قیام گاہ کے سامنے برآمدہ بنوا دیجئے۔ عاقبت سنور جائے گی میری۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔

اسی ہفتے برآمدے کی تعمیر شروع ہو گئی۔ بنیادیں اٹھائی گئیں۔ مستریوں کی کرنڈیوں کی آوازوں میں حکیم جی دن بھر دھوپ میں چارپائی ڈالے تعمیر دیکھنے میں مگن رہتے۔ برآمدہ مکمل ہوا

توحکیم جی دن بھر تکیے پر سجدہ ریز رہے۔ تکیہ آنسوؤں سے بھیگتا رہا۔ ان کی ویران اور بے چین روح بارش میں دھلتی رہی۔ انھیں لگا کہ زندگی بھر کی پریشانیاں اور پشیمانیاں دھل گئی ہیں۔

ہوا سرد تھی ۔۔۔۔۔ عزیز بابا ایک درویش کی مدد سے حکیم جی کی چارپائی کمرے میں اٹھالایا۔ گیلی لکڑیوں کے سلگنے سے کمرے میں دھواں تھا۔ عزیز بابا نے دلیہ حکیم جی کے سامنے رکھا۔ ان کی آنکھیں نم ناک تھیں۔ اس نے اپنا بوڑھا ہاتھ بوڑھے کندھے پر رکھا تو حکیم جی کا پنجر ہلنے لگا اور چشمے بہہ نکلے۔

عزیز بابا، میرا کوئی نہیں، بہن نہ بھائی، رشتہ دار نہ عزیز۔ میری عمر بھر کی کمائی یہی ایک برآمدہ ہے۔ میں اب سکون سے مرسکوں گا۔ عبدالحمید ضرور آئے گا، تم دروازہ کھلا رکھنا۔ اللہ پیر جی کی عمر دراز کرے ۔۔۔۔۔

اگلی صبح حکیم جی کے کہنے پر چارپائی برآمدے میں بچھادی گئی۔ انھوں نے قرآن مجید کھولا۔ عزیز بابا حروف دھندلا کیوں رہے ہیں ۔۔۔۔؟

عینک کے شیشے گدلے ہو رہے ہیں۔

اچھا ۔۔۔۔۔! عزیز بابا چائے تو پلادو، آخری چائے۔ کل میں چلا جاؤں گا۔ مسافر کا سفر مکمل ہوگیا ہے۔ پیر جی سے اجازت لی تھی نا ۔۔۔۔۔ کہ مجھے اپنے قبرستان میں تھوڑی جگہ دے دیں۔ شہرِ خموشاں بھی تو ایک آباد جگہ ہے ۔۔۔۔۔ دیکھو، کتنے لوگ وہاں رہتے ہیں۔ وہاں تنہائی کا احساس تو نہیں ہوگا ۔۔۔۔۔؟ ہمارے شہر بھی تو شہرِ خموشاں سے کم نہیں۔ دیوار سے دیوار جڑی ہے ۔۔۔۔۔ لیکن ہمسایہ کو ہمسائے کی خبر نہیں ۔۔۔۔۔ یہاں اور وہاں کیا فرق ہوا ۔۔۔۔۔؟ عزیز بابا بولو ۔۔۔۔۔ نا۔ تم بھی آنے میں جلدی کرنا۔ وہاں میں تمھارا انتظار کروں گا۔ مجھے کمبل اوڑھادو، سردی لگ رہی ہے۔ آسمان سے فرشتے اتر رہے ہیں ۔۔۔۔۔

حکیم جی، صبر کیجئے۔ مایوسی کفر ہے ۔۔۔۔۔ عزیز بابا کی آنکھیں نم تھیں۔ صبر کیسے کیا جائے۔ عمر بھر کی یادیں سامنے دست بستہ کھڑی ہیں۔ وہ کہی اور ان کہی کا جواب مانگتی ہیں۔ ان یادوں سے کہو، اوٹ میں ہوجائیں۔ آخری لمحے تو مجھے اذیت کی سولی پہ نہ لٹکائیں۔ ایک عورت کی خاطر میں نے کتنی روحوں کے طاقوں میں رکھے چراغ اپنی نافرمانی اور ہٹ دھرمی کی پھونک سے بجھادیئے بابا ۔۔۔۔۔ اماں ۔۔۔۔۔ عبدالحمید، دلاس۔ میں نے کتنے دل توڑے ۔۔۔۔۔ مجھ

غریب الدیار پر آج کوئی رونے والا بھی نہیں۔ عزیز بابا، مجھے جی بھر کے رو لینے دے، میری موت پر کوئی نہیں روئے گا۔ مجھے اپنے مرقد پر اپنے آنسوؤں سے چراغاں کر لینے دے۔

باہر سرد ہوا کا زور اور بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رات تاریک اور خاموش تھی۔ حکیم جی کے اصرار پر کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دیا گیا۔ انھیں یقین تھا عبدالحمید ضرور آئے گا۔ گدلے آئینوں کے پیچھے شفاف آنکھوں میں امید کی رمق باقی تھی۔

عزیز بابا لحاف لپیٹ کر سو گیا۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ عزیز بابا کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ حکیم جی کے خراٹوں کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ ماچس تلاش کی اور چراغ جلایا۔۔۔۔۔ چراغ بھڑکا اور بجھ گیا۔ چراغ دوبارہ روشن کر کے وہ حکیم جی کی چارپائی کے پاس آیا۔ وہاں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے حکیم جی کو چھوا۔ وہ جا چکے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے لحاف ان کے چہرے پر ڈالا۔۔۔۔۔ گھڑی دیکھی اور مسجد کی راہ لی۔

جنازے میں گنے چنے افراد تھے۔ چند درویش اور مدرسے کے طالب علم۔ جسدِ خاکی جب لحد میں اتارا گیا، شرینہہ کے درخت میں کوئی پرندہ رو رہا تھا۔ قبرستان سے لوٹ کر بابا عزیز نے چولہا جلایا اور دیگچی اوپر رکھ دی۔

(۲)

عبدالرحمٰن گلی میں سے گزر رہا تھا۔ اس پر بارش کی بوندیں پڑیں تو اس نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان صاف تھا۔ بوندیں کہاں سے گریں۔۔۔۔۔؟ چوڑیاں کھنکنے کی آواز سن کر اس نے اوپر دیکھا، کلثوم نے اپنے سیاہ بال جھٹکے تھے۔ بالوں سے برسنے والی بوندوں سے عبدالرحمٰن سوچوں کی رم جھم میں بھیگنے لگا۔۔۔۔۔ کب تک۔۔۔۔۔ آخر کب تک یہ چوری چھپے کی ملاقاتیں، کتنے برس گزر گئے۔ کلثوم میرے ساتھ پٹھو گرم کھیلتی اور چھتیں پھلانگتی جوان ہو گئی ہے۔ ہم کب تک سیڑھیوں میں آدھے چاند کی روشنی کے ساتھ پسینہ پسینہ ہوتے رہیں گے؟ کلثوم کو تو ڈر بھی نہیں لگتا، کبھی انگلی مروڑ لیتی ہے۔۔۔۔۔ کبھی بے شرمی سے گال پر چٹکی بھر کے بھاگ جاتی ہے۔۔۔۔۔ اوپر سے رعب جھاڑتی ہے کہ میں بزدل ہوں۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں، بابا کتنے سخت گیر ہیں۔۔۔۔۔ ابھی کل ہی کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ کچھ کرو، نہیں تو میں زہر کھا لوں گی

۔۔۔۔۔کہیں سچ مچ کچھ کر نہ بیٹھے۔۔۔۔۔ پھر ہوگا کیا۔۔۔۔۔؟ بھائی عبدالحمید تو کہہ رہا تھا ۔۔۔۔۔وہ حویلی کے خواب دیکھ رہی ہے۔۔۔۔۔ بھائی بھی بے وقوف ہے، اسے کیا خبر، محبت ہوتی کیا ہے۔۔۔۔۔؟ خواہ مخواہ ہم سے جلتا ہے۔ آج میں ماں سے بات کروں گا۔۔۔۔۔

عبدالرحمٰن گھر پہنچا تو اداس تھا۔۔۔۔۔اس کا ذہن کلثوم کی زلفوں کے حصار میں تھا۔ بڑے حکیم جی کئی دن سے پریشان تھے۔ مطب سے لوٹ کر اہلیہ سے رات گئے تک یہی موضوعِ زیرِ بحث رہتا کہ بیٹے کو کیا روگ لگ گیا ہے؟ پڑھائی سے اس کی طبیعت اچاٹ رہنے لگی ہے۔

رات کھانے کے بعد انھوں نے عبدالرحمٰن کو بلایا تو ان کی اہلیہ نے انھیں نرم لہجے میں بات کرنے کا مشورہ دیا۔

عبدالرحمٰن بابا کی پائنتی سر جھکا کر ناخن چباتا رہا۔

آپ اندر چلئے، میں اپنے چاند سے خود بات کرلوں گی۔ حکیم جی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ عبدالرحمٰن مجرموں کی طرح سر جھکائے خیالوں میں غرق رہا۔ اس کے کانوں میں ابھی تک چوڑیوں کی کھنک اور چہرے پر ریشمی قطروں کے لمس کی ملائمت تھی۔ باہر مطب سے دھم دھم کی آواز آرہی تھی۔ دلاس اوکھلی میں جڑی بوٹیاں کوٹ رہا تھا۔ اس کی ماں نے ملائمت سے پوچھا۔۔۔۔۔ بیٹا بول تو سہی، کیا بات ہے؟ مجھے تو ہم راز بنالے، کیوں روگی بن گیا ہے ۔۔۔۔۔؟ تو نے بن استری کبھی کپڑے نہیں پہنے تھے۔ تیری نزاکت ونفاست کیا ہوئی۔۔۔۔۔ میرے لال، کہاں تو سلوٹ بھرے بستر پر نہیں سوتا تھا اور اب اپنا لباس دیکھ۔ دیکھ تو سہی، تیری صحت گرتی جارہی ہے۔

ماں۔۔۔۔۔ مجھے کوئی روگ، کوئی بیماری نہیں۔۔۔۔۔سب وہم ہے آپ کا پھر بھی ۔۔۔۔۔میرے چندا، تیرا چہرہ۔۔۔۔۔؟

میرے چہرے کو کیا ہے؟ میرے چہرے پر لکھی تحریر کس نے پڑھی اور سمجھی ہے ۔۔۔۔۔؟ سمجھ بھی لیا تو جواب کون لکھے گا۔۔۔۔۔؟ چہرے کی تحریروں کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ چہرے صرف سوالات کی گزرگاہ ہوتے ہیں۔ راہوں میں آوارہ پھرنے والے بے گھر سالوں کو کبھی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ آپ میرے سوالوں کا جواب کہاں سے خریدیں گے۔۔۔۔؟ عبدالرحمٰن اپنے ذہن کی تختی پر لکھے سوالات ماں کو نہ سنا سکا۔

صرف اتنا بولا۔

ماں۔۔۔۔۔۔مجھے۔۔۔۔۔۔مجھے۔۔۔۔۔کلثوم لے دے۔۔۔۔۔!

اس کی ماں نے سکون کا سانس لیا۔ بیماری کی تشخیص ہوجائے تو علاج آسان ہوجاتا ہے۔ عبدالرحمٰن کو آہیں بھرنی پڑیں نہ کلثوم کو چناب میں کچا گھڑا ڈالنا پڑا۔ پُرسکون لہروں پر وقت نے فیصلہ لکھ دیا اور ان کی شادی ہوگئی۔ رکتے وقت کی چال کسے معلوم تھی۔ گھوڑا کب چلے اور پیادہ کس سمت کو جائے۔ کھیل میں شاہ کو بھی مات ہوجاتی ہے۔ شطرنجِ زیست کے مہرے چلتے رہے۔

عبدالرحمٰن نے طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مطب سنبھال لیا۔ دلاس ان کا خاندانی ملازم تھا۔ دن بھر جڑی بوٹیاں کوٹتے، کُشتے کھرل کرتے اور معجون بناتے گنگناتا رہتا۔ اسے بہادر شاہ ظفر کا ایک ہی شعر ازبر تھا۔۔۔۔۔ اوکھلی کی دھم دھم میں وہ مغلیہ عہد کو بھی کھرل کرتا رہتا۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

جڑی بوٹیوں کی نسبت سے اسے زندگی کی تلخیوں کے ذائقے بھی معلوم تھے۔ بڑے حکیم جی اور ماں جی کی موت کے بعد اس نے حکیم عبدالرحمٰن کو زندگی کے نشیب وفراز سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔۔۔۔۔ حکیم عبدالرحمٰن کی جھڑکیوں میں نہ وہ کسی کی آنکھ کا نور رہتا نہ دل کا قرار۔ اوکھلی سے نکلنے والی آواز میں مشتِ غبار بن کے آنسو پیتا رہتا۔

حکیم عبدالرحمٰن کی طب کا دور دور تلک شہرہ تھا۔ لا علاج مریض لائے جاتے جو شفایاب ہوکر جاتے۔ ان کی خالص ادویہ کی دھوم تھی۔ مطب میں ہر وقت جمگھٹا رہتا۔ معاملات کی ترتیب حکیم عبدالرحمٰن نے دی۔ اس کی طبیعت میں تیزی اور قدرے ترشی تھی۔ اسی ترشی کے سبب اس کا بھائی عبدالحمید دل کے پھپھولے لے کر کنارہ گیر ہوگیا۔ بے اولاد ہونے کی وجہ سے حکیم جی میں چڑچڑاپن سرایت کرنے لگا۔ گھر کا سودا سلف، ملازمین کی تنخواہیں اور طب کی آمدن کلثوم کے ہاتھ میں تھی۔ سارے معاملات وہ خود سنبھالتی تھی۔ بڑے حکیم جی روزانہ کی آمدن بینک میں جمع کرایا کرتے تھے۔ کلثوم نے بینک کی بجائے رقم گھر لاکر میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ عبدالرحمٰن کے حواس پر پوری طرح چھا گئی۔ حکیم جی اسی کے دماغ سے سوچتے اور فیصلے کرتے۔ ان کی مردہ

سوچیں ذہن کے قبرستان میں دفن ہوگئیں۔ اس کے بھائی عبدالحمید نے اپنا الگ مکان لے لیا۔ وہ بھائی کے رویے پر کڑھتا رہتا۔ اسے بھائی کے بے اولاد ہونے کے دکھ سے زیادہ کلثوم کی چالوں سے ڈر تھا۔ سمجھانے کی غرض سے عبدالرحمٰن سے جو بات بھی کہتا، چکنے گھڑے کی طرح وہ اس کے ذہن سے پھسل جاتی۔ اس نے بھائی کو کلثوم کے بھائیوں کی عیاری اور مکاری سمجھانے کی پوری سعی کی، لیکن کلثوم کے حسن میں ساری باتیں ماند پڑ گئیں۔ سورج اس دن سوا نیزے پر آیا اور زمین تانبے کی ہوئی جس دن حکیم جی نے حویلی کلثوم کے نام کرنے کا فیصلہ کیا۔ دلاس اور عبدالحمید نے پوری رات جاگ کر گزار دی، لیکن صبح دم وہ وکیل کو ساری کارروائی کرنے سے نہ روک سکے۔

عبدالحمید جس وقت حویلی سے نکلا، کلثوم دالان میں بڑے سے پیڑھے پر زلفیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ اس نے زہر خند مسکراہٹ سے عبدالحمید کو دیکھا اور عبدالحمید ناگن زلفیں آخری بار دیکھ کر باہر نکل آیا۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور۔۔۔۔۔ نہ کسی کے دل کا قرار۔۔۔۔۔ دھم دھما دھم او کھلی۔۔۔۔۔ دھم دھم۔۔۔۔۔ جڑی بوٹیاں۔۔۔۔۔ دھول، دھم دھم۔۔۔۔۔ دلاس جب عبدالحمید سے گلے ملا تو پھوٹ پھوٹ رویا۔ حکیم عبدالرحمٰن مطب میں مصروف تھا۔ گلی میں ایک کالی بلی عبدالحمید کا رستہ کاٹ گئی۔ وہ چونکا اور مڑ کے دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔

حکیم عبدالرحمٰن کو جوڑوں میں درد کی شکایت رہنے لگی۔ گھٹنوں کا درد سوا ہو گیا۔ تمام نسخے آزما دیکھے، لیکن درد بڑھتا گیا۔ جوڑوں کے درد کے ساتھ ساتھ کلثوم کی سرد مہری کا درد ان کے دل میں رہنے لگا۔۔۔۔۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کلثوم کی گرم جوشی سرد پڑتی گئی۔ حویلی میں اس کے بھائیوں کی آمد و رفت بڑھنے لگی اور سازشیں پلنے اور پروان چڑھنے لگیں۔ حکیم جی کی سوچیں کرم خوردہ ہو گئیں۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟ کیوں ہو گیا۔۔۔۔۔؟ اسی کیوں کا جواب تلاش کرتے ہوئے حکیم جی کھنڈر ہو گئے۔ کلثوم تو زلفوں کے ساتھ ساتھ جان چھڑکتی تھی۔۔۔۔۔ اب نمک کیوں۔۔۔۔۔؟ میں اس کی چالیں کیوں نہ جان سکا۔۔۔۔۔؟ سوالوں کے بھنور میں حکیم جی ایسے پھنسے کہ کوئی نکالنے والا بھی نہ رہا۔ کلثوم نے حویلی بھائیوں کے نام کر دی اور میں خاموش تماشائی بنا رہا۔ ہائے میری بے بسی۔۔۔۔۔

حکیم جی دالان کے ایک کونے میں چار پائی پر بیٹھے رہتے۔اپنے آپ سے الجھتے۔ان کی عمر گزرنے لگی۔دلاس کی دھم دھم تھم گئی۔مطب میں کبھی کبھار کوئی مریض آتا۔

اس روز حکیم جی نے دلاس کو جڑی بوٹیاں لانے اور سفوف بنانے کو کہا۔۔۔۔۔بند کیجئے اپنی اس لاڈلی طب کو۔۔۔۔۔کھوٹا پیسہ تک گھر میں نہیں آتا۔۔۔۔۔کلثوم بولی۔

تو نے مجھے کس قابل چھوڑا ہے۔۔۔۔۔

بڈھے مجھے الزام نہ دے۔۔۔۔۔میں نے تجھ سے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔

جھوٹ بکتی ہے تو۔۔۔۔۔

کلثوم کے طعنوں کا کینسر حکیم جی کی ہڈیوں میں سرایت کرنے لگا۔وہ غصے سے کپکپا رہے تھے۔میں نے تمھیں کیا نہیں دیا۔محبت، دولت، شہرت، حویلی، زیور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔تم ۔۔۔۔۔تم نے مجھے کیا دیا۔۔۔۔۔نفرت اور عیاری۔۔۔۔۔! دالان کے ایک کونے میں پڑا ہوں، یہاں سے بھی نکال پھینک۔اللہ کی زمین بہت بڑی ہے کہیں تو پناہ مل جائے گی ۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔جا، میں تجھے گالی بھی نہیں دیتا۔

بڈھے خبیث، دفع ہو یہاں سے۔۔۔۔۔

کلثوم نے حکیم جی کو گھسیٹ کر باہر پھینکا اور کنڈی چڑھالی۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور۔۔۔۔۔دھم۔۔۔۔۔دھم۔۔۔۔۔دھما دھم۔۔۔۔۔نہ کسی کے دل کا قرار۔دلاس چونکا۔۔۔۔۔اٹھ کر حکیم جی کو سنبھالا۔

دلاس۔۔۔۔۔دلاس۔۔۔۔۔مجھے پیر جی کے پاس چھوڑ آؤ۔

(۳)

دلاس، کسی روز بھائی کو نہ مل آئیں۔۔۔۔۔؟

جی، ضرور چلیں گے۔۔۔۔۔دلاس کے آنسو نکل آئے۔۔۔۔۔

لیکن چند دن ٹھہر جاؤ۔مقدمے کا فیصلہ ہو لینے دو۔اللہ کرے ہم مقدمہ جیت جائیں اور عبدالرحمٰن کو حویلی واپس مل جانے کی خوش خبری سنائیں۔۔۔۔۔عبدالحمید کے چہرے پر اطمینان تھا۔

نہیں جی۔۔۔۔۔ابھی چلئے۔۔۔۔۔کتنا عرصہ گزر گیا ہے۔وہ بیمار بھی تو تھے۔ہم نے

پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ کیا سوچتے ہوں گے حکیم جی۔۔۔۔۔؟ دلاس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک بار بھائی عبدالرحمٰن کا کارڈ آیا تھا۔

اچھا۔۔۔۔۔ کیا لکھا تھا۔۔۔۔۔؟

بہادر شاہ کا ایک شعر

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

تیاری کیجئے جی۔۔۔۔۔ دیر نہیں کرنی۔۔۔۔۔ دلاس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مقدمے کا فیصلہ تو ہو لے۔۔۔۔۔

چھوڑیئے جی۔۔۔۔۔ فیصلہ ہوتا رہے گا۔

اور ہاں۔۔۔۔۔ جوارش جالینوس، سفوف جواہر اور انوش دارو ضرور ساتھ لے لینا۔ بھائی خوش ہو جائے گا۔ جانے وہاں اس کی گزر بسر کیسے ہو رہی ہوگی۔۔۔۔۔؟

قریبی اسٹیشن پر اتر کر انھوں نے ٹیکسی پکڑی اور گاؤں کی راہ لی۔ وہ عصر کے قریب پیر جی کی خانقاہ پہنچے۔ ایک درویش نے انھیں برآمدے میں بٹھایا، پانی پلا کر وہ چائے لینے چلا گیا تو دلاس نے پوچھا۔

حکیم جی نظر نہیں آرہے؟

میرے خیال میں سو رہے ہیں۔۔۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔۔۔ سامنے ان کا بکس رکھا ہے اور چارپائی کے ساتھ چپل بھی۔۔۔۔۔ بس مغرب کا وقت ہو رہا ہے، خود جاگ جائیں گے۔ دونوں مطمئن ہو کر باتیں کرنے لگے۔۔۔۔۔ اتنے میں درویش چائے لے آیا۔ پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے اس نے آواز دی۔۔۔۔۔ عزیز بابا اٹھو، اذان دینے کا وقت ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ چادر سرکی، عزیز بابا اٹھا۔۔۔۔۔ عبدالحمید اور دلاس نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

ہمیں تو حکیم عبدالرحمٰن سے ملنا ہے۔

پاؤں میں چپل اڑستے ہوئے بابا عزیز نے کہا۔۔۔۔۔

عبدالحمید۔۔۔۔۔ ''مسافر تو گیا''۔۔۔۔۔!

اندر

چھنا کا سا ہوا۔۔۔۔

وہ چونک اٹھا۔

کچن میں اس کی بیوی ایپرن باندھے حسبِ معمول اپنے کام میں مگن تھی۔

پھر کیا ٹوٹا ہے۔۔۔۔؟ اس نے غصے سے بیوی کو گھورا۔

کچھ بھی تو نہیں ٹوٹا۔ آپ کا وہم ہے۔ اس کی بیوی نے ادرک کے کٹے ہوئے باریک باریک ٹکڑے پریشر کُکر میں ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ پلٹ کر بیڈروم میں آ بیٹھا۔

میری بیوی جھوٹ کہتی ہے۔ کچھ نہ کچھ ضرور ٹوٹا ہے۔ کوئی پیالی یا ڈنر سیٹ کی کوئی چیز ۔۔۔۔۔کتنی لاپرواہے میری بیوی! کہیں یہ چھنا کا میرے اندر تو نہیں ہوا ہے؟ لیکن میرے سینے کے اندر ہے ہی کیا جو ٹوٹے گا اور اندر کے ٹوٹنے کی صدا بھلا باہر کب سنائی دیتی ہے۔ یقیناً کچن میں کوئی چیز ٹوٹی ہے۔ میری بیوی چھپا رہی ہے۔۔۔۔۔ مجھے پھر چل کر دیکھنا چاہیئے۔

وہ دوبارہ کچن میں گیا، برتنوں کے شوکیس کو غور سے دیکھا، اِدھر اُدھر تجسّس کی نگاہوں سے جھانکا۔ بیوی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو پڑھنے کی ناکام کوشش کی، ڈسٹ بن کو الٹ کر دیکھا۔ ڈسٹ بن میں سبزی اور پیاز کے چھلکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس کی بیوی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

آج میں آپ کو سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جاؤں گی۔

ہاں ہاں لے جاؤ۔۔۔۔۔ میں پاگل ہو گیا ہوں، میری کھوپڑی گھوم گئی ہے۔ سب مجھے پاگل سمجھنے لگے ہو، میرے بے کار وجود کی اب اس گھر میں ضرورت ہی کیا ہے؟

ضرور لے جاؤ۔۔۔۔۔ ابھی لے جاؤ۔ میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ اس پر کوئی نئی بات نہیں لکھی۔ آپریشن کرا دیکھو میرا۔ میرے اندر کے سارے ٹکڑے نکال کر ڈرائنگ روم میں سجالینا۔ تمھارے سارے برتین میرے اندر ٹوٹے ہیں نا۔۔۔۔۔ مہنگائی کے اس عذاب میں کولہو کے بیل کی طرح جتا میں زندگی کھینچ رہا ہوں اور تم کہتی ہو۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ تم مجھے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جاؤ گی۔۔۔۔۔ لے جاؤ۔۔۔۔۔ شوق سے۔۔۔۔۔! اس کی بیوی اس کا لال بھبوکا منہ اور شعلہ بار آنکھیں ہونقوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔

کچھ عرصے سے اس کے مزاج میں تندی، ترشی اور تیزی آ گئی تھی۔ ہر بات پر جھلانا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ بس برتن پھینکنے اور توڑنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔۔۔۔

گھر کے تمام افراد نے مل کر اسے کسی طور سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جانے پر راضی کرلیا۔ جب وہ سائیکاٹرسٹ کے کمرے میں داخل ہوا۔

پھر چھنا کا ہوا۔۔۔۔۔!

وہ چونکا اور خوفزدہ ہو گیا۔

یہاں کیا ٹوٹ سکتا ہے۔۔۔۔۔؟ یہ تو ڈاکٹر کا کلینک ہے، میرا گھر تو نہیں!

ڈاکٹر نے قلم سنبھالا اور ہسٹری شیٹ لینے کو سوال مرتب کیے۔ محترمہ ان کی یہ حالت کب سے ہے؟

جی۔۔۔۔۔! پہلے پہل تو مسئلہ اتنا گھمبیر نہیں تھا۔ خاندانی رویّوں اور دوستوں کی بے وفائیوں پر کڑھتے رہتے تھے۔ بعد میں ایسے ہوا، ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو گھر کا سودا سلف لاتے تو تھوڑی دیر جھلاتے۔۔۔۔۔ چینی مہنگی ہوگئی ہے۔ گھی دس روپے فی کلو چڑھ گیا ہے۔۔۔۔۔ چائے پینا کم کرو، چائے کی پتی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ کپڑے دھونے کے لیے اب پاؤڈر کی بجائے دیسی صابن استعمال کیا کرو۔ یہ گھر میں فضول بلب کیوں جل رہے ہیں۔ تین سو یونٹ کے بعد آگ لگ جاتی ہے۔ پانچ روپے فی یونٹ۔۔۔۔۔ زندگی عذاب ہوگئی ہے۔۔۔۔۔ سر ڈھانپو تو پاؤں ننگے ہوتے ہیں۔ پاؤں ڈھانپو تو سر سے چادر سرکتی ہے۔۔۔۔۔ گیس کے سلنڈر کی قیمت دیکھی ہے۔۔۔۔۔ سنا ہے۔۔۔۔۔ اب تو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانی ہوں گی۔۔۔۔۔!

بس جی شروع میں تو یہ جھلاہٹ ہر مہینے کا معمول رہی۔ پٹرول مہنگا ہوا تو انھوں نے دو دن کھانا نہیں کھایا۔ ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ کہنے لگے اب کیا موٹر سائیکل کی ٹینکی میں پانی ڈالا کروں۔۔۔۔۔؟ ہم ان باتوں کے عادی ہو گئے، عادی نہ ہوتے تو کیا کرتے جی۔۔۔۔۔ یہ سارے مسائل حل کرنے ہمارے بس میں تو نہیں تھے۔

اور۔۔۔۔۔ اب۔۔۔۔۔؟ ڈاکٹر نے سوال کیا۔ اب دوسرے تیسرے روز کچن میں آنکلتے ہیں اور کہتے ہیں، چھنا کا ہوا ہے۔ گھر میں کیا ٹوٹا ہے۔ حالاں کہ ہر چیز سلامت ہے۔ کبھی کبھی بلا وجہ بیٹھے بیٹھے ہنس دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

مینار میں دراڑ آگئی ہے۔۔۔۔۔

ایک روز ہم نے پوچھا۔۔۔۔۔ کون سا مینار۔۔۔۔۔؟

کہنے لگے سارے میناروں میں دراڑیں ہیں۔۔۔۔۔

ڈاکٹر صاحب ہم بہت پریشان ہیں، ان کا کچھ کیجئے، یہ کنبے کے واحد کفیل ہیں۔۔۔۔۔ ہمارا کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟

بی بی۔۔۔۔۔گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔

ڈاکٹر نے قلم سنبھالا۔

لیٹر پیڈ جس کا چوتھائی حصہ اس کی ڈگریوں اور تجربوں سے بھرا ہوا تھا، اس پر قلم رکھا ۔۔۔۔۔نسخہ لکھا۔۔۔۔۔

اس نے بیوی سے پہلے خود نسخہ پکڑا، اسے غور سے دیکھا۔۔۔۔۔مسکرایا۔۔۔۔۔ ہنسا اور نسخے کے پُرزے اڑادیئے۔۔۔۔۔

تمھارے اندر بھی دراڑ ہے۔۔۔۔۔ڈاکٹر تم بھی۔۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔۔تم بھی۔۔۔۔۔ ہر مینار، ہر انسان کے اندر دراڑ ہے۔ وہ اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ڈاکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ گھنٹی کا بٹن دباتا ۔۔۔۔۔

اس نے گرج کر کہا۔۔۔۔۔

ڈاکٹر۔۔۔۔۔گھنٹی دینے کی غلطی نہ کرنا۔ ترپن سال سے تم لوگ صرف گھنٹیاں ہی تو دے رہے ہو۔۔۔۔۔ اور کیا ہی کیا ہے تم لوگوں نے۔۔۔۔۔؟ میری بات غور سے سن ۔۔۔۔۔ میں پاگل نہیں ہوں، میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گا، مجھ سے مت ڈر۔۔۔۔۔ جو تیرے اندر ہے اس سے ڈر۔۔۔۔۔ ڈاکٹر نے سیٹ سے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے گرج کر کہا ۔۔۔۔۔

غلام زادے، بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ڈاکٹر سہم کر بیٹھ گیا۔

دیکھو، ڈاکٹر۔۔۔۔۔تو کلونیل عہد کی باقیات میں سے ہے۔ بیٹھ اور میری بات غور سے سن۔۔۔۔۔تو جانتا ہے میں نے نسخہ کیوں پھاڑا ہے۔ اس لیے کہ یہ انگریزی میں لکھا گیا تھا ۔۔۔۔۔

ڈاکٹر نے اطمینان کی سانس لی اور کہا۔

میرے بھائی مسئلہ یہ ہے کہ بازار میں جو ادویات دستیاب ہیں ان پر دوائی کا نام

انگریزی میں رقم ہوتا ہے۔

غلط کہتے ہو تم۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا ہے اب ہر دوائی پر انگریزی کے ساتھ اردو میں بھی نام لکھا ہوتا ہے۔ تم نسخہ اُردو زبان میں لکھو۔ اسے سرکاری زبان کا درجہ ملے نہ ملے، ہمیں اس سے محبت کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ کاغذ قلم سنبھالا اور نسخہ لکھا۔

دیکھ ڈاکٹر۔۔۔۔۔ ایسی دوا مت لکھنا جس میں نیند کا اثر ہو۔

ایسی ادویات میں دماغی سکون کے لیے نیند کا۔۔۔۔۔

دیکھ ڈاکٹر۔۔۔۔۔ اس نے بات اچکتے ہوئے کہا۔ ہم ترپن سال سے سو رہے ہیں۔ نصف صدی۔۔۔۔۔ پوری نصف صدی۔۔۔۔۔ اب صدی کی تکمیل کی طرف سفر جاری ہے۔ ہم سے اور نہیں سویا جاتا۔ ہم جاگنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر کو بڑے عجیب وغریب مریض سے پالا پڑا تھا۔ سینکڑوں مریضوں کا تجربہ رکھنے کے باوجود یہ کیس اپنی نوعیت کا منفرد کیس تھا۔

ادویہ کے استعمال سے کوئی خاطرخواہ افاقہ نہ ہوا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۔۔۔۔۔ گھر والوں نے دوبارہ ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے کہا میں مریض کو گھر پر ہی دیکھوں گا۔

جب ڈاکٹر آیا۔ وہ بڑے پُرتپاک طریقے سے ملا، معانقہ کیا اور اسے ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔۔۔۔۔ اب آپ کیا محسوس کرتے ہیں۔۔۔۔۔؟

یہاں کوئی کیا محسوس کرسکتا ہے۔۔۔۔۔؟ حبس اور گھٹن میں محبوس شخص کیا سوچ سکتا ہے ۔۔۔۔۔؟ کچھ بھی نہیں سوچ سکتا۔۔۔۔۔ ایسے ماحول میں انسان کی سوچیں اپاہج ہو جاتی ہیں۔ وہ ساری عمر اپنی لولی لنگڑی سوچ کو خوش فہمیوں کی لاٹھیوں کی ٹیک پر چلاتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ اور بس۔۔۔۔۔!

اس کی بیوی نے چائے لا کر رکھی۔

ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔۔! اب کئی روز سے یہ کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔

مجھے انصار کی تلاش ہے۔ سارا دن قریہ قریہ، کُو بہ کُو پھرتے ہیں اور صدا لگاتے ہیں: ’’ہے کوئی انصاری جو ہمیں گلے لگا لے۔۔۔۔۔ ہم یوں دربدر نہ ہوں، ہم یثرب کی زمین پر آباد

ہوں۔''

کل کہہ رہے تھے، اخبار میں اشتہار دینا ہے کہ اگر کرۂ ارض پر کہیں کوئی انصاری رہتا ہے تو مہاجر سے فوراً رابطہ کرے اور میرے دکھ آن کر بانٹے۔ مجھے اپنے ساتھ اس سرزمین پر لے جائے جہاں پھول کھلتے ہیں۔

چائے کی خالی پیالی پرچ میں رکھتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔۔۔۔۔

کیس پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔۔۔۔۔انھیں دماغی سکون کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر۔۔۔۔۔سکون کس بازار میں بکتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ، میں اپنا سب کچھ بیچ کر ان کے لیے سکون خریدلاؤں گی۔۔۔۔۔اس کی بیوی رودی۔۔۔۔۔

ڈاکٹر کو ایسی کوئی دکان معلوم نہیں تھی جہاں سے سکون مل سکتا۔۔۔۔۔اس نے اجازت لی۔۔۔۔۔بیوی کی نم ناک آنکھیں دیکھ کر وہ چونکا۔

اس کے اندر چھناکا ہوا۔۔۔۔۔

انھی آنکھوں کی وجہ سے تو میں اسے بیاہ لایا تھا۔۔۔۔۔ان میں آنسو۔۔۔۔۔!اس نے بیوی کو جھوٹی تسلی دی اور کہا۔۔۔۔۔

مجھے سرکاری کام کے سلسلے میں ایک مہینہ گھر سے باہر رہنا ہوگا۔۔۔۔۔

اس حالت میں آپ کو اکیلا کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔۔۔۔۔میرے اندر تو کہیں دراڑ نہیں ہے۔۔۔۔۔میں تو پوری کی پوری آپ کی ہوں۔ پگلی، سرکاری کام کے سلسلے میں پہلے بھی تو میں جاتا رہا ہوں۔۔۔۔۔

اسے کوئی سرکاری کام نہیں تھا۔۔۔۔۔

اسے صرف ایسی دکان کی تلاش تھی جس میں سکون بکتا ہو اور وہ خرید لائے۔ اجنبی شہر میں اجنبی لوگ۔۔۔۔۔وہ ایک ہوٹل میں جا مقیم ہوا۔

سمندر کی سمت کھلنے والی کھڑکی سے وہ پُرسکون سمندر کا نظارہ کرتے ہوئے سوچتا۔۔۔۔۔

میں کب تک دربدر بھٹکتا رہوں گا۔۔۔۔۔ میرا باطنی سکون کہاں کھو گیا ہے؟ ہر طرف کڑے پہرے ہیں۔ جاؤں تو جاؤں کہاں۔۔۔۔۔؟ کوئی دروازہ، کھڑکی، روزن، ہوا کا تازہ جھونکا۔۔۔۔۔؟

ایک دن ہوٹل کی ریسپشن پراس نے کچھ لوگوں کو دیکھا۔ ایک ہی رنگ کی پگڑیاں باندھے، میٹھی میٹھی باتیں کرتے، مسکراتے اسلامی سنتوں کی دعوت دیتے!

وہ ان کے ساتھ چل نکلا۔ ان کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر اس کا دل مسرور ہوا۔ وہ ان میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔۔۔۔۔ بہت دن گزرنے پر وہ نہ تو اس رنگ کی پگڑی باندھ سکا اور نہ اس راستے پر چل سکا۔ اسے یوں محسوس ہوا، وہ سب ایک دائرے میں مقید ہیں۔ بس وہ آپس میں ملتے ہیں، ہنستے ہیں، بولتے ہیں، ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور جو لوگ اس دائرے سے باہر ہیں ان کو وہ اچھوت سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

چھنا کا سا ہوا۔۔۔۔۔ اور وہ پھر چل کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ کسی نئی منزل کی تلاش میں! اس نے ایک اشتہار دیکھا، کسی مسجد میں بہت بڑے خطیب نے تقریر کرنی تھی۔ وہ وہاں پہنچا تو خطاب جاری تھا۔۔۔۔۔ تقریر میں جوش اور ولولہ تھا، بیان سحر انگیز۔۔۔۔۔ لوگوں کے چہروں پر بھی ایک جوش تھا، ان کی آنکھیں عالم کے چہرے پر گڑی اور سماعتیں ہمہ تن گوش تھیں۔ تقریر ختم ہوئی۔

عالم مسجد کے ساتھ ملحق حجرے میں تشریف لے گئے۔

وہ ان سے ملنے وہاں پہنچا۔ تو ایک دربان نے اسے روک کر پوچھا، آپ نے مولانا سے وقت لیا ہے۔۔۔۔۔؟

وقت۔۔۔۔۔ وقت۔۔۔۔۔ وقت اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ وہ وہاں سے الٹے قدموں بھاگا۔ اسے بے سمت سفر کرنا تھا اور بے سمت سفر اسے ہلکان کیے دے رہا تھا۔ وہ سیدھا ہوٹل میں آیا اور بستر پر دھڑام سے گرا۔۔۔۔۔

اسے سب یاد آنے لگے۔ دوست، احباب، رشتہ دار۔۔۔۔۔ بیوی بچے۔۔۔۔۔ وہ سارے سمندر تیاگ کر یہاں پہنچا تھا۔۔۔۔۔ سکون کی تلاش میں۔ اس کی حسیات جاگنے لگیں، یادداشت لوٹنے لگی۔۔۔۔۔ اسے یاد آیا کہ میں نے جب بھی دوستوں سے رابطہ کیا، اپنی مصروفیات تیاگ کر، سفر کی صعوبتیں جھیل کر ان سے ملنے پہنچا، وہ اپنی مصروفیات تیاگنے کو تیار نہ تھے۔ وہ سب مصروفیت کے جنگل میں بھٹکتے تھے۔ جانے کیا تلاش کرتے تھے۔۔۔۔۔؟

اس نے سکون کی تلاش کے لیے کہاں کہاں کی خاک نہ چھانی۔۔۔۔۔

ادیبوں میں جا بیٹھا۔۔۔۔۔وہ غیبت کے پان چباتے اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے تھے۔نرگسیت کے مارے ان لوگوں سے اسے گھن آنے لگی۔اور اب۔۔۔۔۔اب۔۔۔۔۔پگڑی والے۔۔۔۔۔عالم۔۔۔۔۔دوست۔۔۔۔۔ادیب۔۔۔۔۔!

میں کہاں جاؤں۔۔۔۔۔؟ سچ کس بازار میں بکتا ہے، میں خریدار ہوں سچ کا!

کوئی مُول تو بتائے۔۔۔۔۔

اسے پھر یثرب کے انصار یاد آنے لگے۔۔۔۔۔چودہ سو سال کا سفر طے کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔لیکن اسے یہ سفر طے کرنا تھا۔اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو صدیوں کے سفر پر نکلنا ہوگا۔اس ماحول میں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔۔۔۔۔

درزی سے کپڑے سلوانے جاؤ، دس چکر لگوائے گا۔۔۔۔۔فریب ہی فریب۔۔۔۔۔!

فرنیچر والے کے پاس جاؤ۔۔۔۔۔آج کل پر ٹالتا رہے گا۔مکینک کو بلاؤ۔۔۔۔۔سو بہانے تراشے گا۔۔۔۔۔کسی سے قرض کا معاملہ ہو۔۔۔۔۔دے کر بھول جاؤ۔۔۔۔۔

بچوں کی تعلیم کی بات کرو، پہلے فیس طے کریں گے۔۔۔۔۔سالے علم فروش۔۔۔۔۔اتنا جھوٹ۔۔۔۔۔فریب۔۔۔۔۔دھوکا۔۔۔۔۔

تاجر جھوٹ بول بول کر، قسمیں کھا کھا کر دو نمبر مال کو ایک نمبر بنا کر فروخت کرتا ہے۔ملاوٹ ہی ملاوٹ۔۔۔۔۔میں سچ کہاں جا کر تلاش کروں۔۔۔۔۔؟

کیا کتابوں میں سے۔۔۔۔۔؟

اس نے تکیہ دوہرا کر کے سر کے نیچے رکھا، بند مٹھی سمیت کلائی ماتھے پر دھری، آنکھیں موند لیں۔۔۔۔۔

وہ تھکا ماندہ جب یثرب پہنچا تو اس اجنبی دیار میں کوئی اس کو جاننے والا نہ تھا۔۔۔۔۔

کھجور کے باغات میں ستانے کو اس نے کھجور کے ایک تنے سے ٹیک لگائی۔اچانک ایک شخص اس کے قریب آیا۔۔۔۔۔

کس کی تلاش میں ہو۔۔۔۔۔؟

انسانوں کی بستی کی تلاش میں۔۔۔۔۔!

کس دیس سے آرہے ہو۔۔۔۔۔؟

میرا کوئی دیس نہیں۔۔۔۔۔

میرا نام ابوایوب انصاری ہے۔۔۔۔۔آؤ چل کر میرے گھر آرام کرو۔۔۔۔۔

انصاری۔۔۔۔۔؟

چھنا کا سا ہوا۔۔۔۔۔

وہ صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی دی میں وہاں رونق لگ گئی۔۔۔۔۔حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت طفیل بن عمرؓ، نعمان بن حقرانؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، خذیفہ بن یمانؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ، وہ سب کے ساتھ اصحابِ صفہ کے چبوترے پر پہنچا۔۔۔۔۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ پُرسکون تھا۔

اس نے گھر کی راہ لی۔۔۔۔۔شہر کے اسٹیشن پر اتر کر اس نے ہر شے کو بغور دیکھا جیسے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔۔

اپنی گلی میں جب وہ داخل ہوا تو ایک فیصلہ کر چکا تھا۔۔۔۔

گھنٹی دینے پر اس کی بیوی دروازے پر آئی۔۔۔۔۔صوفے پر دراز ہوتے ہوئے اس نے چائے کی خواہش کا اظہار کیا۔۔۔۔۔

گھر کے سب افراد معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔ان کی نظروں میں سوالوں کے جالے تنے تھے۔۔۔۔۔

بظاہر وہ نارمل تھا۔

اچانک اس کی بیوی کو ایک خیال آیا۔۔۔۔۔

وہ کچن میں گئی۔۔۔۔۔

اور قصداً ایک پلیٹ گرائی۔

چھنا کا سا ہوا۔۔۔۔۔

وہ اسی طرح صوفے پر پُرسکون بیٹھا چائے پیتا رہا۔

سب کے چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ اور خوشی تھی۔۔۔۔۔

اسی رات ۔۔۔۔۔ وہ آخرِ شب اٹھا، اس کے باطن میں اندر ہی اندر آسمانِ دنیا پر سے ایک آواز اُترتی جارہی تھی:

''ہے کوئی مانگنے والا جسے عطا کروں''

ہاں ۔۔۔۔۔ میرے رب ۔۔۔۔۔ میں ہوں ۔۔۔۔۔ مجھے عطا کر ۔۔۔۔۔!

پتیاں

ہیلو۔۔۔۔۔جی، السلام علیکم!

وعلیکم السلام، میں ہسپتال سے ریاست علی بول رہا ہوں۔

جناب کیا حال ہے، طبیعت کیسی ہے؟

الحمداللہ، آرام ہے، لیکن پتھریاں موجود ہیں۔

ڈاکٹر کا کیا کہنا ہے۔۔۔۔۔؟

تفصیل پھر، پہلے آپ میرا ایک کام کر دیں۔

جناب۔۔۔۔۔

آپ ڈیوٹی کتنے بجے آف کر رہے ہیں؟

چھ بجے۔

ٹھیک ہے، جس کمرے میں آپ ہیں، دائیں طرف الماری کے آخری کونے میں چابی رکھی ہے، وہ اٹھائیے!

بات تو پوری کیجئے۔

نہیں، پہلے آپ چابی اٹھائیے۔

جی ریاست علی۔۔۔۔۔چابی مٹھی میں ہے۔

اب ایسے ہے کہ لوہے کی جس میز کے سامنے آپ بیٹھے ہیں، اس کی داہنی دراز کھولئے۔

پھر۔۔۔۔۔؟

پہلے دراز کھولئے تو۔۔۔۔۔!

جی کھل گئی۔

اس میں کچھ نظر آیا۔۔۔۔۔

ریاست علی ۔۔۔۔۔ٹشو پیپر کا آدھا رول، ایک ڈسٹر، چائے کا ڈبہ، شاپر میں تھوڑی سی چینی، پلاس، پیچ کس، چند کاغذ، وائزلین کی شیشی ۔۔۔۔۔اور ہاں ۔۔۔۔۔ایک چمچ ۔۔۔۔۔

شاباش اے ۔۔۔۔۔آپ ایسا کیجئے، ان چیزوں کو ہٹائیے۔

ہٹ گئیں ۔۔۔۔۔

کیا نظر آیا ۔۔۔۔۔؟

ڈائری، بن کیپ کے بال پوائنٹ پنسل، بچوں کا لنچ بکس اور ۔۔۔۔۔اور چھوٹی سی ٹارچ۔

بالکل ٹھیک ۔۔۔۔۔آپ ڈائری نکال لیجئے، ممکن ہو تو واپسی پر مجھے ہسپتال پہنچا دیجئے اور تالا بند کر کے چابی ساتھ لیتے آئیے۔

فون چپ ہو گیا۔

ریاست علی اپنے نام کی مناسبت سے وہاڑی کے ایک نواحی چک میں سو کنال اراضی کا مالک تھا۔ اس نے کبھی اپنی زمین ایکڑوں میں بیان نہیں کی کیوں کہ سو کنال اراضی گھٹ کر ساڑھے بارہ ایکڑ رہ جاتی۔ سو کنال کہنے سے بھرم قائم رہتا۔ ریاست علی گفتگو کے دوران اپنے مزارعین کے علاوہ موچی، مُسلّی، تیلی، کمہار اور لوہار کا ذکر کرتا جنھیں ہر سال فصل اٹھنے پر مٹھی بھر اناج باقاعدگی سے دیا جاتا۔ وہ فخریہ لہجے میں بتاتا، دیکھیں جی ۔۔۔۔۔ابھی ڈھیری اٹھتی نہیں کہ موچی، مُسلّی، تیلی، کمہار اور لوہار آ پہنچتے ہیں، انھیں راضی کرنا ہوتا ہے۔ یہ لوگ چار چھ ٹوپے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ کل ملا کر دو بوری گندم میں بھگت جاتے ہیں۔ پہلے ان کا حصہ نکالا جاتا ہے، پھر اناج گھر لایا جاتا ہے۔

یہ یرقان زدہ چہروں والے لوگ گٹھڑیاں اٹھائے، سروں اور پیٹھ پر لادے ان کے پرکھوں کو دعائیں دیتے۔ جن کی دریا دلی سے وہ آج تک مٹھی بھر اناج لینے کے حق دار ٹھہرے چلے آ رہے تھے۔ ہر ایک کے حصے میں پانچ کلوگرام فی ٹوپہ کے حساب سے گندم آتی۔ چند دن تو اگرم رہتا، سال کا بقیہ حصہ وہ حقے بھرتے اور گالیاں کھاتے گزار لیتے۔ نظام بدلنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس لیے ریاست علی بھی دو بوری گندم دے کر مطمئن ہو جاتا۔ اس کا من شانت رہتا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کا فرض اور ریت باقاعدگی سے نبھا رہا ہے۔

نوکری کو نیچ پیشہ سمجھتے ہوئے بھی ریاست علی بجلی کے ایک محکمے میں ملازم ہو گیا۔ ساتھیوں میں گھلنے ملنے کی بجائے اس نے پگ اونچی رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ رکھ رکھاؤ سے عیاں ہوتا کہ وہ بڑے زمین دار گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ جس شعبے میں وہ آیا، اس میں کسی کی سو کنال اراضی نہیں تھی۔ یہ بات اس کے لیے باعثِ اطمینان تھی۔ وقت کے ساتھ پیاز سے چھلکے اترنے لگے۔ ساتھی اس سے بے تکلف ہونے لگے۔ Feudal Lord کہلانے پر وہ بظاہر بُرا مناتا لیکن اس کے چہرے پر سکون کی زیریں لہر صاف محسوس ہوتی۔

وہ ہر کام سلیقے اور ضابطے سے کرنے کا عادی تھا۔ اس کے اصول اٹل تھے۔ اسے ٹیکنیشن سے افسر بننے کا خیال آیا۔ اس نے پروگرام مرتّب کیا، شیڈول ترتیب دے کر انجینئرنگ کی تیاری شروع کردی۔ ان دنوں سیاہ رنگ کی ایک ڈائری اس کی بغل میں رہنے لگی۔ ڈیوٹی کے دوران اس کام سے فرصت ملتی تو وہ غریقِ علم ہوجاتا۔ ڈائری میں الیکٹریکل کے فارمولے درج کرتا۔ Equations بناتا، دنوں میں شاعروں کی بیاض کی مانند ڈائری اس کے وجود کا حصہ ہوگئی۔ ڈیوٹی پر پہنچتے ہی وہ دراز کھول کر وائر لین لگانے کے بعد پہلا کام یہی کرتا۔ ڈائری نکال کر انہماک سے فارمولوں کی تلاوت کرتا۔ ان پر غور و فکر کرتا۔ کام تقسیم ہونے پر بیاض اپنے ساتھ رکھتا۔ دو سال گزرنے پر وہ کوئی پرچہ پاس کرسکا نہ افسر بن سکا۔ دو برسوں کا نچوڑ قیمتی بیاض کی شکل میں اس کا سرمایۂ حیات بن گیا۔

ایک شام شفٹ کے دوران ریاست علی اپنا تاریخی ٹفن کیریئر کھولے کھانا نکال رہا تھا۔ وہ زیرِ لب مسکرایا۔ ٹفن کیریئر میں چار چمچ اور چار پلیٹیں اس طرح ڈیزائین تھے کہ ٹفن کیریئر کھلنے پر وہ گم شدہ خزانے کی طرح نمودار ہوتے۔ ریاست علی کہتا: ''دیکھیں جی، کبھی کبھار گھر والی کوئی میٹھی چیز بنادیتی ہے۔ شفٹ میں ہم چار ساتھی ہیں، مزے سے پلیٹوں میں ڈال کر چمچ سے کھاتے ہیں۔ بات ہوئی، نا۔''

زیرِ لب مسکرانے پر اللہ داد نے اسے دیکھا۔ اللہ داد شعبے میں سائنس دان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کئی برسوں سے سائنسی تجربے اس کی زد میں اور وہ ان کی زد میں تھا۔ وہ پُریقین تھا کہ ایک روز ایسا فارمولا ایجاد کرلے گا جس کی بنیاد پر ملک میں بہت بڑا انقلاب آجائے گا۔ ہوائی جہاز سے لے کر موٹر سائیکل تک میں ایندھن پٹرول اور ڈیزل کی بجائے پانی ہوگا۔ سب سے

بڑی دلیل کالا اسٹیم انجن تھا۔ جب سے پٹرول اور ڈیزل گرانی کی زد میں آئے اس نے کمرے میں جارج اسٹیفن کی تصویر لگالی اور تجربات تیز کر دیئے۔ اس نے کبھی کینٹین میں چائے نہیں پی، کیوں کہ مہینے بھر میں بسکٹ ملا کر پچاس روپیہ خرچہ اٹھتا، لیکن وہ ایک سائنسی رسالے کا سالانہ خریدار تھا۔

ریاست علی خیر ہو، آج بھولے سے کیسے مسکرا دیئے؟ اللہ داد نے پوچھا۔

ریاست علی پھر زیرِ لب مسکرا کر ٹفن کیریئر سے کھانا نکال کر چننے لگا۔ ساتھیوں نے تبدیلی محسوس کی۔ جتنا عرصہ وہ انجینئر نگ کی تیاریوں میں مصروف رہا، اسے بات کرنے اور مسکرانے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ کھانا کھا کر ریاست علی نے انگڑائی لی۔ اللہ داد نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا، کیوں کہ اس سے معدے کی بڑی آنت کو خطرہ تھا۔

اللہ داد میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ ریاست علی نے کہا۔

کیا۔۔۔۔۔؟

بیاض کے اوراق پلٹتے ہوئے ریاست علی نے کہا: ''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں، آپ سب کی طرح میں نے انجینئر نگ ترک کر دی ہے۔''

سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

اس دن سے ریاست علی ساتھیوں میں گھلنے ملنے لگا۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک رہنے لگا۔ جاگیرداری اور افسری کی مسند سے اتر کر عام انسانوں میں آبیٹھا۔ ہنس مکھ اور ہر دل عزیز ہونے لگا۔ شعبے میں کوئی تلخی ہوتی، کوئی الجھتا یا بات بگڑنے لگتی، ریاست علی فوراً صلح کرا دیتا۔ فریقین سے رقم لے کر مٹھائی منگواتا۔ کسی ساتھی کی رنجش طول پکڑنے لگتی تو پریشان رہنے لگتا۔ اٹھتے بیٹھتے یہی تذکرہ رہتا، ''یار صلح ہونے چاہیئے، آپ بھی کچھ کریں نا، دو مسلمان بھائی لڑ بیٹھے ہیں اور ہم ۔۔۔۔۔'' پھر وہ خود ہی ہمت کرتا۔ مٹھائی پلے سے منگوالیتا۔ یہ بات بھلا دی گئی کہ ریاست علی سو کنال اراضی کا مالک ہے۔ وہ نماز باقاعدگی سے ادا کرتا، زکوٰۃ کا حساب رکھتا۔ ایک فکر اسے کھائے جا رہی تھی۔ سٹوڈنٹ لائف میں ہوسٹل کے لڑکوں کا ڈیڑھ سو روپیہ اس کے ذمہ تھا۔ اسے ان لڑکوں کے نام یاد تھے نہ وہ ان کے ٹھکانوں سے واقف تھا جو قرض لوٹا کر سکون پالیتا۔

بیوی کے زیورات زرگر کے پاس لے جا کر اس نے پندرہ برس کا حساب نکلوایا اور اقساط

میں زکوٰۃ ادا کرنے لگا۔ سب کی ضرورتوں کا خیال رکھنے لگا۔ اس کا لہجہ دھیما اور طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا۔ ایک بار دس روپے فی کس شعبے میں اس نے جمع کئے اور ساتھیوں کو پہلی بار پہاڑوں کی سیر پر لے کر نکل گیا۔ واپسی پر دو روپے چار آنے فی کس کے حساب سے لوٹا دیا۔ وہ اپنے حصے کا کام تن دہی اور جان فشانی سے کرتا۔ افسر اسے کام سونپ کر بے فکر ہو جاتے۔ کام کی تکمیل میں جتنی دیر ہو اسے پرواہ نہ تھی۔ شعبے میں لوٹ کر چائے پیتا نہ وقت پر کھانا کھاتا۔ کام مکمل ہونے پر منہ ہاتھ دھو کر ہشاش بشاش شعبے میں لوٹتا۔ باتیں کرتا، ہنستا ہنساتا، کبھی کبھار بیاض نکال کر ادھار، زکوٰۃ اور کمیٹیوں کا حساب لکھتا۔

سب ہنس کر کہتے "یار ریاست علی، تیری بیاض میں بجلی کے فارمولوں کے بجائے شاعری ہوتی تو مزہ رہتا۔"

جناب! یہ فارمولے شاعری سے کم ہیں؟ دو برس کا نچوڑ ہے۔

دورانِ گفتگو ریاست علی موضوع کی جزئیات تک بیان کرتا۔ گفتگو پُر مغز اور مدلّل ہوتی۔ بِنا دلیل وہ بات نہ کرتا، کام کی طرح بات کی باریکیوں کا خیال رکھتا۔ سیاست زیرِ بحث رہتی یا مہنگائی کا ذکر چلتا، تان چینی، پتی، گھی اور پٹرول سے ہوتی بیاض پر آ کے ٹوٹتی۔ معاملہ سالانہ انکری منٹ کا ہو یا IMF کے قرضے کا، بیاض کو مقدس مانا جاتا۔ کام سے تھکے ہوئے ذہن اس بحث میں تھوڑی دیر کو اپنی تھکاوٹ اور مسائل بھول جاتے۔ خوش ہوتے، قہقہے لگاتے، پھر کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پر امید کی پٹی باندھے وقت کے دائرے میں گھومنے لگتے۔

ایک بار ریاست علی ڈرم پر کھڑا کام کر رہا تھا۔ کام کے دوران اسے بجلی کا جھٹکا لگا، پشت کے بل گرنے سے پہلے اسے محمد حیات نے بازوؤں میں سنبھال لیا۔ سنبھالتے سنبھالتے اسے کندھے پر چوٹ آ گئی۔ ساتھی اکٹھے ہو گئے۔

ہمیں فوراً ہسپتال پہنچایا جائے، جھٹکا لگنے سے خون کے سرخ ذرات کو نقصان پہنچا ہوگا۔ ریاست علی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

گاڑی منگوا کر اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ اس کی محبتوں نے شعبے والوں کے دل موہ لیے تھے۔ سب باری باری اگلے چند روز بیمار پُرسی کے لیے ہسپتال جاتے رہے۔

اس نے ساتھیوں کو بتایا، خون کی رپورٹ آ گئی ہے۔ سرخ ذرات پورے ہیں۔ سرجن کا

کہنا ہے کندھے پہ چوٹ کی وجہ سے Muscle کمزور ہوگیا ہے۔ Muscle کا Tissue بھی Damage ہوگیا ہے۔

مسل کا ٹشو کئی دن زیرِ بحث رہا۔ بیاض کے حوالے سے خبر ملی کہ ریاست علی نے سرجن سے کہا کہ ہمارے Damaged Tissue کا معائنہ خوردبین سے کیا جائے۔ سرجن کا کہنا تھا خوردبین سے Tissue کا معائنہ نہیں کیا سکتا ہے۔ ریاست علی مصر تھا، یہ کیسے ممکن نہیں، خون میں ذرات معائنہ کیے جاسکتے ہیں تو Tissue کیوں نہیں؟

بیس دن کی بیڈ ریسٹ کے بعد ریاست علی واپس آیا۔ نسخے پر دوائیوں کے علاوہ اس سے ہلکا کام لینے کا فرمان بھی بہ قلم سرجن لکھا تھا۔ نسخہ افسر مجاز کو دکھایا گیا۔

اس دوپہر ریاست علی اپنی بیاض میں جانے کیا اندراج کر رہا تھا۔ شعبے کے اکلوتے کنوارے تنویر بیگ جو چند ماہ سے باقاعدہ ٹنڈ کرا رہا تھا کیوں کہ اس کے بال جھڑنے لگے تھے اور اسے ابھی شادی رچانا تھی نے سوال کیا۔

ریاست علی، بیاض میں ٹشو کا ذکر ہے؟

نہیں بھائی نہیں، ریاست علی ہنسا۔

اتنے میں ماجد جو ہمہ وقت کتابیں چاٹتا رہتا تھا، جانے پڑھتا تھا کہ رعب جھاڑتا تھا، شعبے والے اس کی موٹی موٹی کتابوں سے نالاں تھے، کہنے لگے۔

تنویر بیگ تم Damaged Tissue کی بات کر رہے ہو، پچھلے دنوں سورج کی روشنی، آواز کی رفتار اور قوسِ قزح کا جو ذکر چلا تھا، ساری بحث طے کرنے میں بیاض میں درج فارمولے ہی تو کام آئے تھے۔

مثلاً۔۔۔۔؟

دیکھیں جی، بات آئیوڈین ملے نمک کی ہو، فیملی پلاننگ، حالات حاضرہ یا آکسیجن ہائیڈروجن کا ذکر چلے، الحمد اللہ اپنے ریاست علی کی بیاض میں فارمولے درج ہیں۔

یار وخوفِ خدا کرو، اس میں صرف الیکٹریکل کے فارمولے درج ہیں۔ ریاست علی نے صفائی پیش کی۔

نہیں، نہیں بیاض گنجینۂ اسرار ہے۔ ماجد نے بات کو طول دیا۔

وہ کیسے؟ آوازیں اٹھیں۔

ہم سب کا بائیوڈیٹا اس میں درج ہے۔

مگر کیسے۔۔۔۔۔؟

ماجد نے کھنکار کر گلا صاف کیا، کندھے اچکائے، ناک پر انگلی رکھی کر زور سے سانس لیا۔

یہ بیاضِ ریاست علی ہے اس میں شفقت علی کے بارے میں لکھا ہے۔

کیا۔۔۔۔۔؟

شفقت علی معدے کا دائمی مریض ہے، وہم کی دیوی اس پر مہربان ہے۔ دوائیوں پر زندہ ہے۔ جس روز دوائیاں چھوڑ دے گا، مر جائے گا۔ اس نے کوئی ڈاکٹر، حکیم، سنیاسی، سیانا، وید، ہومیو پیتھ اور آرویدک ایسا نہیں جو آزمانہ لیا ہو۔ شفقت علی آٹھ بجے دفتر پہنچتا ہے، آٹھ بج کر دس منٹ پر سفید گولی، دس بجے دیسی پھکی، گیارہ بج کر بیس منٹ پر سرخ گولی اور ایک بجے سفید محلول کے دو ڈھکن پیتا ہے۔ تین بجے ہومیو پیتھک گولیاں چوستا ہے۔ چار بجے واپس جاتے ہوئے کوئی نہ کوئی جڑی بوٹی چباتا نظر آتا ہے۔ وہ تو خیر تھی جو جی چاہتا کرتا، لمحۂ فکریہ یہ ہے اس نے مونس کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ مونس کو تو ایسی ادویات کے نام ازبر ہو گئے ہیں جو کمپنی والے بھی بھول چکے ہوں گے۔ کیا وقت تھا، مونس دس دس سموسے ڈکار لیے بغیر معدے میں اتار لیا کرتا تھا، اب نیند کی ننھی سی گولی نگلنی مشکل ہے۔ پھیکا سالن کھاتا اور بدمزہ باتیں کرتا ہے۔ سالن کی طرح ان کی طبیعت کا مزہ بھی جاتا رہا ہے۔

اور ملک اعتزاز۔۔۔۔۔

ماجد یار خدارا، بس کرو، بہت ہو گیا۔ یہ میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ ریاست علی نے منت کی۔

بیان جاری ہو۔ ملک اعتزاز نے میز پر زور سے مکا مارا۔

ملک اعتزاز جلیبی کی طرح سیدھا ہے اور میٹھا بھی۔ شعبے والوں نے جلیبی سیدھی کرنے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ مٹھاس پر گزارا کر رہے ہیں۔ ''کالے خان'' نے یومِ پیدایش سے بال نہیں کٹوائے۔ سفید شلوار قمیص پہنتا اور مقروض رہتا ہے۔ مقروض نہ ہو تو اسے نیند نہیں آتی۔ اس بات پر خوش ہے کہ لوگ اس کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ بھلے سے قرض کا تقاضا کرنے آتے ہیں۔ کثیر العیال ہے۔ عبدالودود کے بھی اس ماہ نو بچے ہو گئے۔ میاں بیوی سمیت کرکٹ ٹیم مکمل

ہوگئی۔ عبدالودود شعبے میں غصیلا، ہٹ دھرم اور ضدی مشہور ہے۔ اس کا طبی ناشتہ مشہور ہے۔ زکام ،الرجی اور طاقت کے نسخے اس کی جیب میں رکھے رہتے ہیں۔ وہ کم طاقت اور کم بچوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کا کہنا ہے جب انسان مرنے بند نہیں ہو رہے تو پیدا ہونے کیوں بند ہوں؟ پہلے مرنے کا بھی قانون مرتب کرایا جائے کہ اتنی تعداد سے زیادہ کو نہیں مرنا۔ پھر بھلے پیداد ہونے پر پابندی لگائی جائے۔ اسے کبھی پریشان نہیں دیکھا گیا۔ سارے امور رب کے سپرد کر رکھے ہیں۔ کبھی اس نے قرض نہیں لیا۔ چہرے پر اطمینان اور لالی ہے۔

مقبول اور مجیب الرحمٰن کاروباری ذہن رکھتے ہیں۔ نوکری کے علاوہ ان کی دکانیں ہیں۔ شام اور رات کا کچھ حصہ وہ دکانوں پر گزار کر گھر لوٹتے ہیں تو بیوی بچے سو چکے ہوتے ہیں۔ واشنگ مشین، پنکھے، مدھانیاں اور بجلی کا دیگر سامان اقساط پر دے کر سرگرداں ہیں۔ اقساط بروقت جمع نہیں ہو رہیں۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو نادہندگان کی لسٹ لیے انھیں گھیرتے ہیں۔ کسی کی گردن پر ہاتھ ڈالتے ہیں، کسی کا بازو مروڑ لیتے ہیں، چند سکوں کی وصولی اور پھر اگلے ماہ کا انتظار! دائرہ در دائرہ مسائل، ہر مہینے وہی لسٹ، نادہندگان اور زمین گول ہے۔

ساجد علی ساجد کو ایک بار افسر نے گھگو کہہ دیا۔ اس نے نیچرل ادھ کھلی آنکھ کے گوشے سے افسر کا جائزہ لیا اور کہا۔ ''تو گھگو، تیرا باپ گھگو، تیرا دادا گھگو، تیرا پردادا گھگو، تیرا سارا خاندان گھگو۔''

افسر ہکا بکا رہ گیا۔ وارننگ دینے کے علاوہ اور کیا کرتا۔

بدکلامی اور خوش کلامی کے درمیان معلق ساجد علی ساجد مجموعۂ اضداد ہے۔ پُر پیچ نفسیاتی عوارض میں مبتلا اپنی ذات میں مطمئن نہ زمانے سے۔ بدکلامی پر اُترے تو دنیا بھر کی مغلظات بک دے گا۔ طبیعت میں ٹھہراؤ آئے تو ہنس ہنس کر گلے لگائے گا۔

پورا شعبہ یوں دم سادھے بیاضِ ریاست علی سن رہا تھا جیسے ماجد کسی درخت تلے چاندنی رات میں میر امن کی ''باغ و بہار'' سنا رہا ہے۔

ماجد تجھے اللہ پوچھے گا۔ ریاست علی نے کہا۔

سارے خوش کہ بیاض میں ان کا ذکر موجود ہے اور ریاست علی الجھتا رہا کہ مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اگلے چند دنوں میں ریاست علی آتے بہانے ماجد کو چھیڑنے لگا، ہماری بیاض میں اور کیا کیا لکھا ہے؟ پھر پورا شعبہ چسکے لیتا۔ بیاض شعبے میں اہمیت اختیار کرتی چلی گئی۔

ماجد بیاض لے کر ہسپتال پہنچا۔ ریاست علی باہر لان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔ وہ دردِ گردہ کی وجہ سے ایک ماہ سے ہسپتال میں تھا۔

ریاست علی، تمھاری بیاض۔۔۔۔۔

ماجد بھائی، معمولی سی ڈائری ہے۔ آپ نے بیاض کا نام دے کر اسے کیا سے کیا بنا دیا۔ ڈائری ہی رہنے دیں۔

نہیں، ریاست علی۔ اسے بیاض کے نام سے یاد رکھا جائے گا۔

اچھا، آؤ اندر کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ ریاست علی نے پاؤں میں چپل اٹکاتے ہوئے کہا۔ نہیں ریاست علی، انشاء اللہ میں شام کو آؤں گا۔ گپ شپ ہوگی۔ ماجد نے یہ کہہ کر اجازت لی۔

شام کو ماجد ہسپتال پہنچا۔ پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ لوگ مریضوں کے لیے روٹی، چائے اور فروٹ لیے آ رہے تھے۔ ماجد کمرے میں داخل ہوا تو ریاست علی اپنی بیاض کھولے کچھ لکھ رہا تھا۔

آؤ آؤ ماجد بیٹھو، اس نے بیاض بند کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کا کیا کہنا ہے۔۔۔۔؟

پتھریاں ہیں۔

پھر؟

شاید آپریشن ہو، ریاست علی کے چہرے پر پریشانی تھی۔

تم نے کیا سوچا؟

ریاست علی نے ڈائری سے ایک سادہ ورق نکال کر اپنے سامنے رکھا۔ ماجد اس کی لرزتی انگلیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر میں اس نے کاغذ کا رخ ماجد کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

یہ گردے ہیں، یہ پیشاب کی نالیاں، Urine پاس ہوتا ہے، مثانہ دیکھیں۔ یہ چار پتھریاں ہیں۔ الٹرا ساؤنڈ کے بعد سرجن نے تفصیل بتائی ہے۔ آپ ڈرائنگ سمجھ رہے ہیں، نا۔

ہاں سمجھ رہا ہوں۔

شاید سرجن کچھ عرصہ اور انتظار کرے۔ پیشاب کے ذریعے خارج ہو گئیں تو ٹھیک، بصورت دیگر آپریشن ناگزیر ہے۔

اچھا، ماجد نے ہولے سے کہا۔

ماجد تمھیں چپ کیوں لگی ہے؟ ریاست علی نے پوچھا۔

سوچ رہا ہوں دوست، تمھاری بیاض واقعی گنجینۂ اسرار ہے۔ اب دیکھو نا، گردوں کا سکیچ اور فارمولا تم نے اسی سے لیا ہے۔ لیا ہے نا؟

ریاست علی اتنی زور سے ہنسا کہ ساتھ والے بیڈ پر لیٹے مریض نے منہ سے کمبل سرکا کر دیکھا۔

ریاست علی ہنسے کیوں۔۔۔۔۔؟ ماجد نے پوچھا۔

یار تو نے نہال کر دیا۔ مہینے بھر میں پہلی بار کھل کر ہنسا ہوں۔ مہنگائی، کم تنخواہ، گھر کے مسائل، بچوں کا مستقبل اور پھر دردِ گردہ نے تو مجھے لیموں کی طرح نچوڑ لیا ہے۔ ماجد تم میری بیاض پر جو کہو، بُرا نہیں مناؤں گا۔

یہ بھی بیاض میں لکھا ہے۔۔۔۔۔ ماجد نے شرارتاً سوال کیا۔

دوسرا قہقہہ، مریض نے پھر کمبل سرکایا۔

دو ماہ بعد جب ریاست علی ڈیوٹی پر آیا، کئی دن ساتھیوں کو کاغذ پر گردے مثانے کا سکیچ بنا کر دکھاتا رہا۔ پتھریاں چار ہی رہیں، نہ کم نہ زیادہ۔

وقت سیڑھیاں آہستہ آہستہ چڑھے یا تیز، کسی نامعلوم سیڑھی پر ہمارا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ وقت سیڑھیاں نہیں گنتا، ہم گن لیتے ہیں۔ ملازمت کی پچیسویں سیڑھی پر ریاست علی ریٹائر ہو گیا۔

الوداعی تقریب شعبے اور کمپنی کی طرف سے الگ الگ ہوئی۔ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے ماجد نے بیاض کا ذکر چھیڑا تو تالیوں کی گونج تیز ہو گئی۔

تین دن بعد ریاست علی نے ساتھیوں کو گھر پر مدعو کیا۔ رات کھانے کے بعد سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔

لان میں ریاست علی اور ماجد ماضی کی بیاض کھول بیٹھے۔ پچیس سال سرک گئے تھے۔ ریاست علی ایک دم عمر رسیدہ نظر آنے لگا۔

ریاست علی زندگی میں کسی سے محبت ہوئی؟

بیاض میں دیکھ لو۔۔۔۔۔۔وہ ہنسا۔

جاؤ لے آؤ۔۔۔۔۔

وہ بیاض لے آیا۔

ڈائری میں فارمولوں، کمیٹیوں کے حساب اور لین دین کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس میں کچھ بھی تو نہیں، کوئی شعر، نظم نہ غزل، خشک فارمولوں کے سوا کیا ہے؟ یہ میں ہی تھا ریاست علی جس نے تمھاری بیاض کو وہ کر دکھایا کہ امر ہو گئی۔ ہمیں یاد رکھو نہ رکھو، سو کنال اراضی کے کنارے لگے درختوں کی چھاؤں میں بیاض کی یاد تمھیں گدگدائے گی۔ ماجد نے ٹھنڈی سانس لی۔

نہیں ماجد بھائی، نہیں۔ بات ایسے نہیں۔

پھر کیا ہے؟

بیاض سنبھالے رکھنے کی وجہ تھی۔

وجہ؟

ہاں وجہ۔۔۔۔۔

سمجھا نہیں۔

ریاست علی نے نفاست سے بیاض کا بوسیدہ ریگزین کور اتارا۔ گتے پر گلاب کی پتیاں بکھری تھیں۔

ماجد یہ۔۔۔۔۔

ابھی ریاست علی نے اتنا ہی کہا تھا۔

ہوا کے جھونکے سے پتیاں فضا میں بکھر گئیں۔

گھیراؤ

سب کی زبانیں گنگ تھیں اور سوچیں مفلوج۔۔۔۔۔

جس چوک میں شام سمے وہ ستانے آنکلتے تھے، اس میں چہار اطراف سے سڑکیں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے گزرتی تھیں۔

اور چوک کے وسط میں ایک قد آدم مینار تھا جس پر بہت سی تحریریں ثبت تھیں۔ سرِ شام آنکلنے والے لوگ سبز گھاس پر بازوؤں کا تکیہ بچھا کر لیٹ جاتے، خوش گپیاں، قہقہے، تاش، لڈو کھیلنا اور مسائل سے فرار ان کے مشغلے تھے۔ پارک میں آ کر وہ یوں محسوس کرتے جیسے کوئی دکھ دکھ نہیں رہا۔ بس ہر طرف چین ہی چین ہے۔ کلاشنکوف اُگلتی گولیوں کو بھی وہ چین کی بنسی سمجھتے تھے۔

اوئے کتنے گرے۔۔۔۔۔؟ ایک دوسرے سے وہ سوال کرتے۔

اور پھر اپنی دنیا میں لوٹ جاتے۔

اس روز کوئی نیا واقعہ تو نہیں ہوا، بس انہونی ہوگئی۔

مغربی سمت سے ایک فوجی ٹرک چوک میں داخل ہوا۔ مخالف سمت سے آنے والی منہ زور لینڈ کروزر ڈرائیور کے قابو میں نہ رہی اور ٹرک سے جا ٹکرائی۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔

کاٹن کے کڑکڑاتے اجلے کپڑوں میں ملبوس ایک درمیانے قد کے نوجوان نے پائیدان پر قدم دھرا اور رعونت سمیت اُترا۔ ٹکر کی وجہ سے لینڈ کروزر کا داہنی طرف کا دروازہ اندر دھنس گیا تھا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے ٹرک ڈرائیور کو گھورا اور وردی کے احترام کو نظرانداز کرتے

ہوئے کہا۔

اندھے ہو۔۔۔۔۔؟

مجمع ہنسنے لگا۔

سالا خود اندھا ہے۔۔۔۔۔کسی نے سرگوشی کی۔

سرگوشی اس کی کنپٹی پر گولی کی طرح لگی۔اس نے قہر آلود نظروں سے مجمع کو گھورتے اور کف چھوڑتے ہوئے کہا۔

میں اُس کی ماں۔۔۔۔۔!

ٹرک ڈرائیور نے بڑے اطمینان سے کہا ''سر، غلطی آپ سے ہوئی ہے۔حادثہ آپ کی تیز رفتاری کے باعث پیش آیا ہے۔

لینڈ کروزر چلانے کا سلیقہ نہ ہو تو سیٹ پر بیٹھنا ہی نہیں چاہیئے۔ اس کی کنپٹی پر ایک اور سنسناتی ہوئی گولی لگی۔

میں سب سمجھتا ہوں۔دیکھ لوں گا تم سب کو۔۔۔۔۔اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور ایس پی سے بات کرنے لگا۔ نہ جانے ایس پی نے اس سے کیا کہا، اسی طرح جلا بھنا وہ لینڈ کروزر میں بیٹھا، ریورس گیئر لگایا اور ٹائروں کی چرچراتی ہوئی آواز سمیت غائب ہو گیا۔

مجمع پھر پارک میں پھیل گیا۔

دلوں میں پھیلی باتیں پارک میں اکٹھی ہونے اور سرگوشیاں کرنے لگیں۔

یار ہے کوئی پوچھنے والا۔۔۔۔۔؟

چور الٹا کوتوال کو ڈانٹے۔۔۔۔۔

بس یار، یہ سیٹ ہی ایسی ہے۔۔۔۔۔!

کیسی ہے۔۔۔۔۔؟ دن بھر سڑک کے کنارے روڑی کوٹنے والے ایک مزدور نے پوچھا۔

یہی۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔انسان انسانیت کے دائرے سے نکل کر ہی اس پر بیٹھتا ہے۔

تم سب چھوٹے دماغ کے ہو۔۔۔۔۔ایک میٹرک فیل کلرک نے کہا۔

تم سب کیا جانو، لینڈ کروزر کیسے چلائی جاتی ہے؟ جس کا کام اسی کو ساجھے!

چلانا جانتا تھا تو چلا رہا تھا۔۔۔۔۔

خاک چلا رہا تھا۔۔۔۔۔اسے ڈرائیونگ آتی تو یوں دے مارتا۔

ٹرک بھی کون سا سیدھا چل رہا تھا۔۔۔۔۔ایک ریڑھی والے فارغ البال نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

جیسا بھی چل رہا تھا۔۔۔۔۔تھا تو اپنے ہاتھ پر۔اس کے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

یار۔۔۔۔۔!میں تو ڈر رہا تھا۔۔۔۔۔ریڑھی والے نے کہا۔

تم تو ہمیشہ ڈرتے کانپتے رہتے ہو۔

میری بات تو سن لو۔۔۔۔۔

سناؤ۔۔۔۔۔!

دو باتیں۔۔۔۔۔دو۔۔۔۔۔اس نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

یک نہ شد دو شد۔۔۔۔۔کسی نے گرہ لگائی۔

میری بات کو یوں مذاق میں نہ اُڑاؤ۔۔۔۔۔!

ایک زیادہ سیانے نے سارے مجمع کو چپ کرایا۔۔۔۔۔اور کہا۔۔۔۔۔

یار۔۔۔۔۔بات یہ ہے کہ لینڈ کروزر والے نے ایس پی سے فون پر بات کی اور بغیر کچھ بولے۔۔۔۔۔یہ جا۔۔۔۔۔وہ جا۔۔۔۔۔استاد خطرہ ہی خطرہ ہے۔۔۔۔۔!

تُو بڑا کھوجی کتا ہے۔۔۔۔۔خطرے کی بُو سونگھ لیتا ہے۔

چپ کراوئے،ابھی اس نے دوسری بات بھی بتانی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ٹرک والے فوجی آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

لو۔۔۔۔۔کرلو۔۔۔۔۔گل۔۔۔۔۔یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ایسا کون سا دفعہ ایک سو چوالیس لگا ہے جو دو بندوں کو آپس میں بات بھی نہ کرنے دے۔۔۔۔۔

پُتر فکر نہ کر،وقت آنے والا ہے،تیرے زندہ رہنے پر بھی ٹیکس لگ جائے گا۔تین سو پینسٹھ دن میں تو جتنے سانس لے گا،نا۔۔۔۔۔اسی حساب سے ٹیکس لگے گا۔سورج کی روشنی اور حرارت پر بھی ٹیکس لگے گا۔

اگلے روز وہ سارے پارک میں بیٹھے خوش گپیوں میں مگن تھے۔کوئی ریڈیو کان سے لگائے

خبریں سن رہا تھا۔ کوئی سگریٹ کے دھویں میں غم اڑا رہا تھا، چند بے فکرے تاش پھینٹ رہے تھے۔ اتنے میں پولیس کا ٹرک آ کر رُکا۔ اس میں سے باوردی سپاہی کود کود کر اترے اور پارک میں گھس آئے۔۔۔۔۔

اٹھو اوئے حرام زادو۔۔۔۔۔ گورنمنٹ نے پارک میں بیٹھنے پر پابندی لگا دی ہے۔

مگر پابندی کیوں لگا دی ہے۔۔۔۔۔؟ ریڑھی والے نے پوچھا۔

بہت چلتی ہے تیری زبان۔۔۔۔۔ قینچی کی طرح۔۔۔۔۔ سپاہی نے اس کی پشت پر بید مارتے ہوئے کہا۔ پولیس کے لاٹھی چارج کی وجہ سے لوگ وہاں سے دم دبا کر بھاگے اور پارک اجڑ گیا۔ اگلے چند روز میں وہاں خاردار باڑھ لگا دی گئی۔

پارک میں بیٹھنے والوں نے سوچا۔۔۔۔۔ یہ ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے؟ ہمارا قصور کیا ہے؟ میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔۔ لینڈ کروزر والے نے ایس پی سے کوئی خاص بات کی ہے۔۔۔۔۔ اب بھگتو۔۔۔۔۔ فروٹ والے نے کہا۔

ہم عدالت میں جائیں گے۔۔۔۔۔ ایک کلرک نے بازو لہراتے ہوئے کہا۔ یہ پارک اور اس میں موجود مینار ہم نے اپنے خون پسینے سے بنایا ہے۔ ہمیں اس کے سائے میں بیٹھنے سے روکنے والے یہ کون ہوتے ہیں؟ عوامی حکومت ہے، عوام کا فیصلہ چلے گا۔ اوئے نامرادو۔۔۔۔۔ پارک سے تمہیں نکال پھینکنے کا فیصلہ بھی تو عوامی فیصلہ ہے۔ تمہارے منتخب نمائندوں کا کیا دھرا ہے، یہ سب۔۔۔۔۔!

سب نے مل کر چندہ جمع کیا۔

شہر کے قابل ترین وکیل کے سپرد اپنا مقدمہ کیا اور عدالت کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہوگئی۔ ہر پیشی پر وہ یہ امید لے کر جاتے کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا۔ جب فیصلے میں تاخیر ہونے لگی تو ان کے اعصاب چٹخنے لگے اور قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ مقدمہ طول پکڑتا گیا۔۔۔۔۔

آخر کار ان کی جیت ہوئی اور پارک کی رونقیں لوٹ آئیں۔ ان کا خیال تھا کہ مقدمہ جیت لینے سے ساری زندگی کے مسائل حل ہو گئے ہیں۔ اب نہ کوئی مسئلہ پیدا ہوگا اور نہ ہی دکھ رہے گا۔

پارک ان کا ہے۔۔۔۔۔

اب توہمیں قانونی تحفظ حاصل ہوگیا ہے۔ بھلے سے جتنی لاقانونیت ہو، چور بازاری اور رشوت کا بازار گرم ہو، لیکن عدالتوں کا احترام تو موجود ہے نا۔۔۔۔۔اگر عدالت کا احترام نہ ہوتا تو آج ہم پارک میں کہاں موجود ہوتے۔۔۔۔۔

اب ہم پر کوئی ٹیکس نہیں لگے گا۔

کہیں لاش نہیں گرے گی۔

ڈکیتیوں کے پھاٹک بند ہوجائیں گے۔

تھانے۔۔۔۔۔دارالامان بن جائیں گے۔

وہ سارے۔۔۔۔۔تصورات اور خوش فہمیوں کی میٹھی گولیاں پھانک کر سو گئے۔ رات کا کوئی سمے تھا۔۔۔۔۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کی زبانیں گنگ اور سوچیں مفلوج ہوگئیں۔ ان کے پارک کو پھر گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔

اور۔۔۔۔۔

چہار اطراف ٹرک ہی ٹرک تھے۔

بخت جلے

رات یخ بستہ اور تاریک تھی۔

اپنے ہی گھر میں اس نے برسوں بعد آ قیام کیا تھا۔ یہ ان کی قدیم خاندانی حویلی تھی۔ بوگن ویلیا کی بیلوں نے مغلئی طرز کے برآمدوں کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔ حویلی میں غروبِ آفتاب سے پہلے ہی شام ہو جاتی تھی۔ درختوں کے جھنڈ، بیلیں، پودے اور ان کے سائے حویلی کو ڈھانپ لیتے، کشادہ کمروں کی کھڑکیوں کے شیشوں پر کہر چھا جاتی، مکین اپنے اپنے کمروں میں جا بسیرا کرتے۔ تنہائی پوری حویلی کو آسیب کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

رات یخ بستہ اور تاریک تھی۔

وہ اس حویلی میں مقیم تھا جس کی ہر اینٹ میں اس کی زندگی مدفون تھی۔ اسے اپنی زندگی، اپنے تشخص اور اپنے حق کے لیے وقت نے ایک موقعہ اور دیا اور اسے وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے جس کمرے میں ٹھہرایا گیا وہ ایک کشادہ اور ہوادار کمرہ تھا۔ اس کے تین اطراف میں کھڑکیاں تھیں۔ قدیم عہد کے اس کمرے کی اونچائی بیس فٹ تھی۔ کھڑکیوں کے اوپر بڑے بڑے روشن دان تھے جن کی ڈوریاں لٹک رہی تھیں۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے وہ ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں رات گزار رہا ہے۔ ٹرین آنے میں ابھی بہت دیر ہے۔ اسٹیشن ماسٹر بھی اپنے گھر کو سدھار چکا ہے۔ باہر پلیٹ فارم پر لگے اکلوتے لیمپ پول میں تیل کا دیا ٹمٹما رہا ہے اور اسے سرد

اور تاریک رات میں گاڑی کا انتظار ہے۔ کون سی گاڑی؟ اسے تو سمت ہی معلوم نہیں تھی۔ اس کا تو سارا سفر ہی بے سمت تھا۔ اسے تو بھائیوں نے اس روز بھی نہیں پوچھا تھا جس روز حویلی دو حصوں میں منقسم ہوئی۔ اسے تو اتنا حق بھی نہیں دیا گیا تھا کہ وہ منقسم حویلی کے ایک کمرے میں اپنی زندگی گزار لے۔ جانے میرا حق کیوں دبالیا گیا۔۔۔۔۔؟ پورے خاندان میں سے کوئی بھی تو نہیں بولا تھا کہ اس کا حصہ غصب کرنے والے اسے سر چھپانے کی جگہ تو دے دیں۔ اس کی تو ساری زندگی بھٹکتے گزری۔ نہ سر پہ سائباں نہ ہی کوئی آشیاں۔۔۔۔۔؟

کھڑکیوں پر دھند اور کہرا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں ایستادہ لکڑی کی الماری کے کنڈے میں زنگ آلودہ تالا جھول رہا تھا۔ وہ گنجلک سوچوں کے حصار میں الجھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک موٹا تازہ پلا ہوا چوہا گزرا تو اسے دیکھ کر کانپ گیا۔ تو کیا حویلیوں میں چوہے ناگزیر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔؟ چوہے۔۔۔۔۔! اسے چوہوں سے خوف آتا تھا۔ طاعون پھیل جانے کا خوف، مرجانے کا خوف، گھر گھر سے جنازہ اٹھنے کا خوف اسے ہولا کر رکھ دیتا۔ تو میرے بھائیوں نے اتنے برسوں میں ان چوہوں کا بھی کوئی سدِّ باب نہیں کیا۔ یہ تو حویلی کی قیمتی اشیاء کو کُتر کر کھا گئے ہوں گے۔ کیسے پلے پلائے خوفناک چوہے ہیں، بالکل مسٹنڈے، جیسے پالتو۔۔۔۔۔!

قدیم حویلیوں کے مکینوں کو اپنے مہمانوں کو یوں دیوزاد کمروں میں تنہا نہیں سلانا چاہیئے۔ کسی ہال کمرے میں سب کو اکٹھے رات گزار لینی چاہیئے، جہاں چوہے نہ ہوں، طاعون نہ پھیلے۔ ایک اور چوہے کے گزرنے پر اس نے لحاف گرداگرد لپیٹا، کمرے کا پھر ایک بار جائزہ لیا اور ہنسا۔۔۔۔۔ پلیٹ فارم۔۔۔۔۔ زندگی۔۔۔۔۔ حویلی۔۔۔۔۔ میری زندگی کی مثلث۔۔۔۔۔!

اس کی منتشر سوچیں کسی ایک نقطے پر مجتمع نہیں ہو رہی تھیں۔

اس نے الماری کو بہ غور دیکھا۔

الماری کا تالا کھُلا ہے۔ اسے قصداً تو کھُلا نہیں چھوڑ دیا گیا۔ گم شدہ دستاویزات اسی الماری میں تو مقفل نہیں تھیں، تو بھائیوں نے حویلی کا اسباب بھی بانٹ لیا، الماری بڑے بھائی کے حصے میں آئی ہے۔ اسی الماری میں سے فائل نکال کر دستاویزات پر مجھے دستخط کرنے کو کہا گیا تھا۔ اب الماری میں کیا رکھا ہے؟ شاید ٹوٹے پھوٹے برتن، ردی سامان، لیکن تالا کیوں کھُلا ہے؟

میرے بھائی تو آپس کی باتیں بھی مقفل رکھتے تھے۔ کیا مجھے آج کی رات اسی آسیب میں کاٹنی ہے؟ سردیوں کی راتیں اتنی طویل کیوں ہوتی ہیں؟ اگر مجھے اپنی وراثت کا حصہ نہ ملا اور میرے بھائیوں نے برادرانِ یوسف کا کردار ادا کیا تو یہ حویلی چاہِ یوسف بن جائے گی۔ مجھے اس کنویں سے نکالے گا کون ـ ـ ـ ـ ـ؟ میں پیغمبر تو ہوں نہیں۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ اپنے حصے کا مطالبہ ہی نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ زندگی کی اہمیت جائداد سے کہیں زیادہ ہے۔ جائداد بچاتے ہوئے انسان زندگی ہار جائے تو وہ جائداد کس کام کی ـ ـ ـ ـ ـ! بہت دیر کردی میں نے۔ نئی نسل میں تو کوئی مجھے پہچانتا ہی نہیں۔ نہ بھتیجے نہ بھتیجیاں ـ ـ ـ ـ ـ۔ ان سب کو کون بتائے گا کہ میں کون ہوں اور میرا ان سے رشتہ کیا ہے؟ مجھے سرِ شام ہی بھائیوں سے بات کرلینی چاہیئے تھی۔ اب یہ سرد اور طویل رات کیسے کٹے گی؟ اگر میرے بھائیوں نے مجھے قتل کردیا تو پھر ـ ـ ـ ـ ـ؟ مجھے انہیں اپنی آمد کا مقصد بتادینا چاہیئے تھا۔ لیکن نہیں، وہ مجھے قتل نہیں کریں گے۔ انھوں نے مجھ سے دستاویزات پر دستخط بھی تو لینے ہیں۔ مجھے ان کو جگا دینا چاہیئے۔ اس رات کے عذاب سے بہتر ہے صبح کا انتظار نہ کھینچا جائے۔ وہ لحاف سے نکلا تو الماری نے اسے روک لیا۔ یہ بے جان الماری مجھے کیوں زندہ لوگوں کی طرح خائف کرنے لگی ہے۔ اسے کھول لینا چاہیئے۔ شاید کوئی ثبوت، بابا حضور کی بوسیدہ ڈائری کا کوئی ورق، کہیں کوئی ایسی بات جس سے مجھے سر پہ سائبان کا سامان کرنے میں آسانی ہوجائے ـ ـ ـ ـ ـ۔ اس نے ڈرتے اور لرزتے ہوئے الماری کھول لی ـ ـ ـ ـ ـ۔ وہ اس کی زندگی کی طرح خالی تھی۔

چلو ایک وہم تو نکلا ـ ـ ـ ـ ـ۔ ایک خوف تو اپنی موت آپ مرا ـ ـ ـ ـ ـ!

اس نے بے جان الماری کے منقش در پر ہاتھ رکھا۔ ماضی اس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔ اس نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے آنکھ کے کونے میں ٹھہرے ماضی کو پونچھا اور سوچنے لگا میں برسوں بعد اس حویلی میں آیا ہوں۔ میرے آنے سے چہروں پر رونق کیوں نہیں ہے۔ کیا میری کوئی اہمیت نہیں۔ کس کی اہمیت ہے، میری یا میری جائداد کی؟ میں جان دار ہوں، جائداد بے جان شے ہے۔ بے جان شے سے اتنی محبت کیوں؟ زندہ چیزوں سے محبت کیوں نہیں کی جاتی، لوگوں کو بے جان چیزیں اتنی عزیز کیوں ہوتی ہیں؟ ہم پورے گھر کی آرایش بھی بے جان چیزوں سے کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ یہ گھر مکینوں کو بے جان چیزوں سے ہی کیوں بھلے لگتے ہیں؟ گھروں

میں تو صرف انسانوں کا بسیرا ہونا چاہیئے۔ اس حویلی میں رونق اور کھنک کیوں نہیں ہے؟ مجھے پلیٹ فارم ایسے کمروں میں سُلا کر کیا وہ خود سکون کی نیند سو گئے ہوں گے۔ وہ بھی جاگ رہے ہوں گے۔ اگر جاگنا ہی تھا تو سب مل کر جاگ لیتے۔

رات ختم ہونے والی ہے۔

یہ میرے بھائی ہیں کیا۔۔۔۔؟ ان سے تو اجنبیت کی بُو آتی ہے۔ مجھے لوٹ جانا چاہیئے، اپنے حصے کا مطالبہ بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ حویلی تقسیم در تقسیم ہوتی رہی تو اپنا تشخص کھو دے گی۔ ہماری پشتینی دشمن تو ازل سے اسی تاک میں ہے کہ اس حویلی کی ایک ایک اینٹ الگ کر دی جائے۔

رات سرد اور تاریک تھی۔۔۔۔!

صبح ناشتے کی میز پر حویلی کے سب مکین جمع تھے۔

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھا چُپ چاپ ناشتہ کرتا رہا۔

بچے اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے لیے اجنبی تھا۔ ناشتے کے دوران ہی اس نے فائل چپکے سے بڑے بھائی کے آگے سرکائی۔

میں حویلی کے معاملے میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔۔۔۔

سب چہرے کِھل اٹھے۔

بچے متحیر تھے کہ بیچ میں معاملہ کیا ہے؟

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے سب کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے اس نے کرسی میز کے اندر سرکائی۔

ایک بچے نے شوقِ تجسس میں پوچھا۔

انکل۔۔۔۔!ایک بات پوچھوں؟

پوچھو بیٹا۔۔۔۔!

آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ ہماری تو خاندانی روایت ہے کہ اس میز پر صرف ہمارا اپنا خون ہی بیٹھ کر ہمارے ساتھ طعام میں شریک ہو سکتا ہے۔

بیٹا۔۔۔۔! آج سے آپ کی یہ روایت ٹوٹ گئی۔

وہ کیسے انکل۔۔۔۔؟